شاہکار رسالت

آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

شاہکار رسالت

مؤلف: آیۃ اللہ شہید مرتضیٰ مطہری

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

فہرست

حرف ناشر

مقدمہ

قرآن کی رو سے امت مسلمہ ایک امت وسط ہے۔

انسانی ضروریات

ذمہ داری کی منتقلی

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

مقدمہ

دین اسلام کا ظہور اس کے ابدی ہونے اور سلسلہ نبوت کے ختم ہونے کا اعلان دونوں کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے۔

مسلمانوں نے ختم نبوت کو ہمیشہ ایک امر واقعہ کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ان کے سامنے یہ سوال کبھی نہیں آیا کہ حضرت محمد (ص) کے بعد کوئی دسرا پیغمبر بھی آئے گا یا نہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے سلسلہ نبوت کے ختم ہونے کا بڑی صراحت کے ساتھ اعلان کیا ہے اور پیغمبر (ص) نے خود بھی کئی بار اس کا اعادہ کیا ہے، مسلمانوں میں رسول اکرم (ص) کے بعد کسی دوسرے پیغمبر کے ظہور کے خیال کو خدا کی وحدانیت یا قیامت کے انکار کے مشابہ اور ایمان کے منافی سمجھا گیا ہے۔

مفکرین اسلام نے ختم نبوت کے مسئلے پر اگر کوئی تحقیقی و علمی کاوش کی ہے تو اس کا مقصد گمراہ کن خیالات کی بیخ کنی کرنا اور عقید ※ ختم نبوت کو زیادہ سے زایدہ واضح اور روشن کرنا رہا ہے۔

ہاں ہم وحی و نبوت کی ماہیئت پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وحی ایک ایسی رہنامئی کا نام ہے جو غیب و ملکوت کے ساتھ ضمیر کے ربط و اتصال سے حاصل ہوتی ہے، نبی، تمام انسانوں اور عالم غیب سے ربط و تعلق کا ایک ویلہ ہے، درحقیقت وہ عالم انسانیت اور جہان غیب کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔

نبوت، شخصی اور انفرادی پہلو سے ایک فرد انسانی کی روحانی شخصیت کی وسعت کا نام ہے اور عمومی و اجتماعی پہلو سے نبوت کا مطلب عالم انسانیت کے لئے ایک ایسا پیام الٰہی ہے جو اس کی رہنمائی کی خاطر ایک منتخب شخصیت کے ذریعہ بھیجا گیا ہے۔یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے عقید ※ ختم نبوت سے متعلق مختلف سوالات سامنے آتے ہیں۔کیا خاتم النبیین (ص) کے بعد کسی دورے نبی کے ظاہر نہ ہونے اور سلسلہ نبوت کے ختم ہو جانے سے روحانی و معنوی پہلوؤں سے انسانیت کو کسی تنزل کا سامنا کرنا پڑا ہے؟ کیا مادر زمانہ ایسے ملکوتی صفات فرزندوں کو جنم دینے سے عاجز ہو چکی ہے جو عالم غیب و ملکوت سے رشتہ رکھتے ہیں؟ کیا ختم نبوت کا اعلان کرنے کا مطلب فطرت کا بانجھ ہو جانا اور ایسے عالی مرتبت فرزندوں کو وجود میں لانے کی صلاحیت سے اس کا محروم ہو جانا ہے؟

اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان خدا کی رہنمائی اور اس کا پیغام کا محتاج ہے۔اس کی یہ ضرورت ہی سلسلہ نبوت کے آغاز کا سبب بنی۔ ماضی میں مختلف زمانوں اور ادوار کے تقاضوں کے مطابق پیغام الٰہی کی تجدید ہوتی رہی ہے۔پیغمبروں کا پے در پے آنا شریعتوں کی مسلسل تجدید اور کتب آسمانی کا یکی بعد دیگری نزول اس لئے ہوا کہ ہر دور میں انسان کی ضروریات میں تغیر آتا رہا ہے اور انسان کو ہر زمانے میں ایک نئے پیغمبر کی ضرورت رہی ہے۔ جب یہ صورت ہے تو کس طرح یہ بات فرض کی جا سکتی ہے کہ ختم نبوت کے اعلان کے ساتھ ہی یہ رابط یک دم منقطع ہو گیا اور وہ پل کہ جس نے عالم انسانیت کو عالم غیب کے ساتھ جوڑ رکھا تھا وہ یک بیک ڈھ گیا ہے۔اس کے بعد اب کوئی الٰہی پیغام انسانیت کی طرف نہیں بھیجا جائے گا تو کیا انسانیت کو فرائض اور ذمہ داریوں کے بغیر یونہی

آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔ہم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ نوح (ع)، ابراہیم (ع)، موسیٰ (ع) اور عیسیٰ (ع) جیسے صاحب شریعت پیغمبروں کے درمیانی زمانوں میں کچھ دوسرے پیغمبروں کا سلسلہ بھی موجود رہا ہے" اس سلسلے سے تعلق رکھنے والے پیغمبر اپنے سے پہلے کی شریعت کو نافذ کرنے اور پھیلانے کا کام انجام دیتے رہے ہیں۔نوح علیہ السالم کے بعد ہزاروں انبیا آئے۔ان انبیاء نے نوح علیہ السلام کی شریعت کو نافذ کیا اور پھیلایا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد بھی ایسا ہی ہوا۔ بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ شریعت اسلام کی آمد کے ساتھ ہی شریعت لانے والی نبوت اور شریعتوں کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے بعد تبلیغی نبوتوں کا سلسلہ کیوں منقطع ہوگیا" جبکہ ماضی میں ہر شریعت کے نازل ہونے کے بعد بے شمار پیغمبر ظاہر ہوتے رہے اور ظہر ہوتے رہے اور سابق شریعت کی تبلیغ، ترویج اور نگہبانی کا فرض ادا کرتے رہے لیکن اسلام کی درآمد کے بعد اس طرح کا ایک پیغمبر بھی ظاہر نہ ہوا؟

یہ ہیں وہ سوالات جو عقیدہ ختم نبوت کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں۔ختم نبوت کا عقیدہ اسلام نے پیش کیا ہے اور وہی اس کا جواب بھی دیتا ہے۔

اسلام نے ختم نبوت کے عقیدہ کو ایک ایسے جامع فلسفہ کی صورت میں پیش کیا ہے کہ ذہنوں میں کوئی شک وابہام باقی نہیں رہتا۔

اسلام کی رو سے ختم نبوت کا عقیدہ نہ انسانیت کے تنزل کی علامت ہے اور نہ انسانی صلاحیت کے نقصان کی نہ مادر زمانہ کے بانجھ ہوجانے کی، اور نہ عقیدہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسانیت اب پیغام الٰہی سے بے نیاز ہوچکی ہے اور انسان کو مختلف ناسازگار زمانوں کے تقاضوں کے مطابق کسی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔اسلام اس بارے میں ایک دوسرا ہی فلسفہ اور توجیہ پیش کرتا ہے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا چاہیئے کہ اسلام نے خود ختم نبوت کے بارے میں کیا کہا ہے، اس کے بعد ان سوالات کا جواب تلاش کرنا چاہیئے۔سورہ احزاب کی آیت ۴۰ میں ہم پڑھتے ہیں

"ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین" "محمد تم مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں ہے لیکن وہ اللہ کا رسول (ص) اور انبیا کے سلسلے کو ختم کرنے والا ہے"

اس آیت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاتم النبیین کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ختم کا لفظ عربی لغت کے اعتبار سے ایک بایسی چیز کے لئے بولتا جاتا ہے جو کسی دوسری چیز کے سلسے کو ختم کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔اس لئے اس مہر کو خاتم کہتے ہیں جو خط بند کرنے کے بعد لفافے پر لگائی جاتی ہے۔روج کے مطابق انگشتری کے نگینے پر نام یا دستخط کندہ ہوتے ہیں اور وہی خطوط پر ثبت کئے جاتے ہیں" اسی لئے انگشتری کو خاتم کہا جاتا ہے۔قرآن میں جہاں کہیں اور جس صورت میں بھی "ختم" کا مادہ استعمال کیا گیا ہے ختم کرنے یا بند کرنے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ سورہ یسین کی آیت ۶۵ میں آیا ہے: "الیوم نختم علی افواھھم و تکلمنا ایدیھم و تشھد ارجلھم بما کانو یکسبون"

" آج ہم ان کے منہ پر مہر لگاتے ہیں اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کرتے ہیں اور ان کے پیر جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس

پر گواہی دیتے ہیں۔"

زیر بحث آیت کا انداز خود یہ بتاتا ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے پیغمبر اسلام پر سلسلہ نبوت کا ختم ہونا کا ختم ہونا مسلمانوں کے درمیان ایک مسلمہ امر کی حیثیت رکھتا تھا۔مسلمان جس طرح محمد (ص) کو خدا کا رسول (ص) سمجھتے تھے اسی طرح ان کے خاتم النبیین ہونے پر بھی یقین رکھتے تھے۔آیت صرف یہ یاد دلاتی ہے کہ محمد (ص) کو کسی کے باپ کی حیثیت سے نہ پکارو بلکہ حقیقی خطاب رسول اللہ اور خاتم النبیین سے آپ (ص) کو مخاطب کرو۔

یہ آیت عقید ؚ ختم نبوت کے اصل جوہر کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

سور ؚ حجر آیت ۹ میں اس طرح آیا ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ۝۹

" ہم نے خود اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم خوس اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

اس آیت میں قرآن کو کسی طرح بھی تحریف وتغییر اور ضیاع سے محفوظ رکھنے کا وعدہ جس قطعیت کے ساتھ کیا گیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔

نئے نئے پیغمبروں کی درآمد اور رسالت کی تجدیدی کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب انبیاء کی لائی ہوئی مقدس کتابوں اور تعلیمات میں لوگوں کی جانب سے کی جانے والی تحریفات اور تبدیلیاں بھی ہیں۔ان ہی تحریفات کے سبب سابق انبیاء کی کتابوں اور تعلیمات میں لوگوں کی ہدایت کی صلاحیت پوری طرح باقی نہیں رہی تھی۔غالباً یہی وجہ ہے کہ پے در پے پیغمبروں کو بھیجا گیا تاکہ وہ انبیاء کی فراموش کی ہوئی نعمتوں کو زندہ کریں اور ان کی تعلیمات میں جو تحریفات کی گئی ہیں ان کی اصلاح کریں۔

قطع نظر ان انبیاء کے جو صاحب کتاب وا شریعت تھے بلکہ ایک صاحب کتاب وشریعت پیغمبر کے تابع تھے جیسا کہ ابراہیم (ع) کے موسی (ع) کے زمانے تک آنے والے پیغمبر اور موسی (ع) سے عیسی (ع) تک ظاہر ہونے والے پیغمبر خود صاحب شریعت انبیاء نے بھی اپنے سے پہلے گزرنے والے پیغمبروں کے ضابطوں اور طریقوں کی تائید کی ہے۔پیغمبروں کے پے در پے آنے کا واحد سبب وہ تحریفات تبدیلیاں تھیں جو آسمانی کتابوں اور انبیاء کی تعلیمات میں کی گئی تھیں۔

چند ہزار سال قبل انسان میں یہ صلاحیت موجود نہیں تھی کہ وہ اپنے علمی اور دینی ورثوں کی حفاظت کرسکے،ابھی انسان کے اندر اس صلاحیت کے پیدا ہونے کے لئے کافی وقت درکار تھا کہ وہ اپنے دینی ورثوں کو ہر طرح کے نقصان سے بچا کر محفوظ رکھ سکے اور اپنی تکمیل وترقی کے ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں پیغام الہٰی کی تجدید اور نئے پیغمبروں کی آمد ضرورت باقی نہ رہے اور ایک دین کی ہیشگی کے ساتھ باقی رہنے کی لازمی شرط (کافی شرط نہیں) پوری ہوجائے۔

متذکرہ بالا آیت نزول قرآن کے بعد سے نبوت ورسالت کی تجدید کے ایک اہم سبب کے ختم ہوجونے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور درحقیقت ختم نبوت کی ایک بڑی بنیاد کی توثیق کرتی ہے۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں آسمانی کتابوں میں سے اگر کوئی کتاب کسی کمی وبیشی کے بغیر پوری طرح اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہے تو یہ صرف قرآن مجید ہے، اس کے علاوہ رسول اکرم (ص) کی بہت سی سنر یں قطعی صورت میں بلاتر دید آفات زمانہ سے آج تک محفوظ چلی آرہی ہیں، ہم اس بات کی بعد میں وضاحت کریں گے کہ کتاب آسمانی کو محفوظ رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو ذریعہ بنایا وہ اس دور کے انسان کی رشدو قابلیت ہے جسے انسان کے اجتماع بلوغ کی نشانی کہا جاسکتا ہے۔

درحقیقت ختم نبوت کے ستونوں میں سے ایک بڑا ستون انسان کا س حد تک اجتماعی بلوغ حاصل کرلینا ہے کہ وہ اپنے علمی اور دینی ورثوں کی حفاظت کر سکے ان می نشرو اشاعت تعلیم و تبلیغ اور تفسیر و توضیح کر سکے، اس پہلو پر ہم بعد میں بحث کریں گے۔

پورا قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک دین ایک ہی ہے اور تمام پیغمبروں نے انسانیت کو ایک ہی دین کی طرف دعوت دی ہے سورہ شوری کی آیت ۱۳ میں آیا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى

اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمد) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس ہدایت ہم ابراہیم اور موسی اور عیسی کو دے چکے ہیں۔

قرآن نے ہر جگہ اس دین کو اسلام ہی کے نام سے یاد کیا ہے جس کی طرف آدم سے لے کر خاتم تک تمام انبیاء نے لوگوں کو دعوت دی ہے۔ مراد یہ نہیں ہے کہ ہر زمانے میں اس دین کا نام "لفظا" اسلام ہی آیا ہے، مدعا یہ کہ دین جس حقیقت و ماہیت کا حامل ہے اس کا بہترین اظہار لفظ اسلام ہی ہوسکتا ہے۔ سور ﷼ آل عمران کی آیت ٦٧ میں ابراہیم علیہ السلام کے بارہ میں آیا ہے:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ

ترجمہ:" ابراہیم یہودی تھا نہ عیسائی بلکہ وہ تو ایک مسلم یکسو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔"

سور ﷼ بقرہ کی آیت ۱۳۲ میں حضرت یعقوب (ع) اور ان کے لڑکوں کے بارے میں آیا ہے۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ﴿۱۳۲﴾

ترجمہ:" اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت ابراہیم نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوب (ع) نے اپنی اولاد کو کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ میرے بچو، اللہ نے تمہارے لئے یہی دین پیدا کیا ہے لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔"

اس بارے میں قرآن کی آیتیں بہت زیادہ ہیں ان سب کا یہاں حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے البتہ پیغمبروں کی لائی ہوئی

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

شعریعتوں اور قوانین میں باہم کچھ اختلاف رہا ہے۔قرآن جہاں تمام انبیاء کے دین کو ایک ہی قرار دیتا ہے بعض مسائل میں چریعتوں اور قوانین میں اختلاف کو تسلیم کرتا ہے۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا۔

ترجمہ:" ہم نے تم (انسانوں) میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کیا۔" [1]

انبیاء(ع) نے جن فکری اور علمی اصولوں کی طرف دعوت دیہے وہ چونکہ بغیر کسی اختلاف کے ایک ہی ہیں اس لئے وہ شاہراہ اور ہدف بھی ایک ہے جس کی جانب انسانوں کو بلانے کے لئے انہیں مامور کیا گیا تھا۔شریعتوں اور قوانین کے جزئی اختلاف کا اس جوہر اور ماہیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا جسے قرآن کی اصطلاح میں اسلام کہا گیا ہے۔انبیاء کی تعلیمات میں باہمی فرق واختلاف کسی ملک کے مختلف منصوبوں اور لوائح عمل کا سا ہے ہر چند کہ انہیں الگ الگ روبعمل لایا جاتا ہے لیکن وہ سب ملک کے ایک ہی آئین سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔پیغمبروں کی تعلیمات اپنے باہمی جزئی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے تکمیل واتمام کا سبب بنتی ہیں۔

پیغمبروں کی آسمانی تعلیمات کا فرق وختلاف ان مکاتب خیال کے باہمی اختلاف کی طرح نہیں ہے جو فلسفہ" سیاست" اجتماعات اور اقتصادیات سے تعلق رکھتے ہیں اور متضاد افکار کا حامل ہوتے ہیں۔تمام انبیاء ایک ہی مکتب سے تعلق رکھتے ہیں اور سب کا thestssایک ہی رہا ہے۔

انبیاء کی تعلیمات میں باہمی اختلاف کسی درسگاہ کی اعلی وادنی جماعتوں کی تعلیمات کی طرح کا ہے یا پھر ایک اصول کے مختف حالات وشرائط میں نفاذ سے پیدا ہونے والے اختلاف کا سا۔

ہم اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اعلی جماعتوں کے طالب علم کو نہ صرف نئے نئے مسائل سے واقفیت حاصل ہوتی ہے بلکہ ان پرانے مسائل کے بارے میں بھی اس کی رائے تبدیل ہوجاتی ہے جس کا علم اس نے ابتدائی جماعتوں میں حاصل کیا تھا۔انبیاء کی تعلیمات کا بھی یہی حال ہے۔

توحید وہ پہلا سنگ بنیاد ہے جسے انبیاء نصب کرنے میں مصروف رہے ہیں لیکن یہی توحید درجات ومراتب رکھتی ہے۔عام آدمی خدائے واحد کا جو تصور رکھتا ہے وہ ایک عارف کے قلب میں پیدا ہونے والی الہی تجلی کی طرح نہیں ہے۔خود عارفوں کے درجات بھی مختلف ہیں: لوعلم ابوذر مافی قلب سلمان لقتلہ 2

" اگر ابوذر رحمہ اللہ علیہ جو کچھ سلمان رحمہ اللہ علیہ کے دل میں تھا اس سے واقف ہوجاتے تو ان کے بارے میں کفر کا گمان کرنے لگتے اور انہیں قتل کردیتے"!

یہ بات واضح ہے کہ سورہ حدید کی ابتدائی آیات اور سورہ حشر کی آخری آیات اور سورہ قل ھواللہ احد کی آیات چند ہزار سال

---

[1] سورۂ مائدہ، آیت ۴۸۔

بلکہ ایک ہزار سال پہلے کے انسان کے لئے قابل ہضم ہوسکتی تھیں۔ البتہ اہل توحید میں سے تھوڑے لوگ ان آیات کی گہرائی تک پہنچ سکتے تھے کتب اسلامی میں یہ بات آئی ہے کہ: "اللہ تعالی علم رکھتا تھا کہ بعد کے زمانوں میں گہری فکر رکھنے والے لوگ پیدا ہوں گے تو اس نے قل ھواللہ کی آیت اور سورہ حدید کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل کیں"

کسی بھی بنیادی اصول کے نفاذ کی عملی صورتیں مختلف حالات میں مختلف ہوتی ہیں انبیاء کے عملی رویے میں جو فرق و اختلاف نظر آتا ہے اس کا تعلق قانون کے نفاذ سے قانون کی روح سے نہیں۔ اس پہلو پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔

قرآن نے دین کے کلمے کو کبھی جمع کی صورت میں استعمال نہیں کیا۔ قرآن میں دین کا ذکر ہر جگہ واحد و مفرد شکل میں کیا گیا ہے، کیونکہ آدم (ع) سے لے کر خاتم تک صرف ایک دین موجود رہا ہے کئی ادیان نہیں۔ قرآن نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ دین فطرت کا تقاضا اور انسان کے روحانی وجود کی آواز ہے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ [1]

اے محمد (ص) اپنا رخ (اپنا فکر) دین کی سمت جما دو اس حالت میں کہ تم وحدانیت پرست ہو، جو خدا کی فطرت (آفرینش پیدائش) ہے جس پر لوگوں کو خلق کیا گیا ہے۔

انسان کی فطرت، سرشت اور طبیعت گونا گون ہے جبکہ دین ابتدائے آفرینش سے قیامت تک ایک ہی ہے اور وہ انسانی فطرت و سرشت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس طرح انسانی فطرت و سرشت بھی ایک سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اس میں ایک بڑا راز اور عظیم فلسفہ پوشیدہ ہے اور اسی سے ہمیں ارتقاء کا ایک خاص تصور ملتا ہے۔ ارتقا کے نظریئے سے سب واقف ہیں اس مسئلے پر ہر جگہ گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ دنیا کا ارتقاء جنداروں کا ارتقاء انسان اور معاشرہ کا ارتقاء۔

یہ ارتقاء کیا چیز ہے اور یہ کس طرح صورت پذیر ہتوتا ہے؟ کیا یہ اسباب کا ایک اتفاقی سلسلہ ہے جو ارتقاء کی منزل تک پہنچتا ہے؟ کیا اس کی سرشت میں کوئی ایسی چیز ہے جو خود تکمیل تک پہنچتی ہے اور وہ اپنے اندر ارتقاء کی خواہش رکھتی ہے اس لئے اس نے پہلے سے اپنے لئے ارتقاء کی ایک راہ منتخب کر رکھی ہے؟ کیا ارتقاء کا عمل ہمیشہ ایک مقرر و متعین راہ پر اور پہلے سے طے شدہ مقصد و ہدف کے مطابق وقوع پذیر ہوتا ہے یا یہ عمل چند ایک بار اتفاقی اسباب کے تحت ایک خاص راستے پر صورت پذیر ہوتا ہے اور مسلسل اپنی سمت بدلتا رہتا ہے اور اپنا کوئی خاص مقصد و ہدف نہیں رکھتا؟

قرآن کی رو دے دنیا انسان اور معاشرہ کا ارتقاء ایک ہدایت یافتہ یا ہدف عمل ہے اور یہ اس ایکی راہ پر صورت پذیر ہوتا ہے جسے صارط مستقیم کہا گیا ہے اس عمل کا نقطہ آغاز اور راہ سفر اور منزل مقصود سب متعین و مشخص ہیں۔

انسان اور معاشرہ تغیر پذیر و ترقی پذیر ہیں لیکن ان کی سمت اور راہ سفر صرف ایک ہی ہے اور وہ مستقیم ہے۔

---

[1] سورۂ روم، آیت ۳۰.

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ " [1]

ترجمہ: نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔

کی خط است از اول تا بہ آخر

بر او خلق خدا جملہ مسافر

انسانی ارتقاء کا معاملہ اس طرح کا نہیں ہے کہ وہ ہر دور میں اسباب کے ایک خاص سلسلے کے تحت (صنعتی یا اجتماعی یا اقتصادی) ایک راہ پر اپنا سفر شروع کرے اور مسلسل اپنا راستہ اور سمت دونوں بدلتا رہے۔

قرآن بڑی شدت کے ساتھ دین کے ایک ہونے پر زور دیتا ہے وہ صرف ایک شاہراہ کا قائل ہے شریعتوں اور قوانین کے اختلافات کو وہ ایسی شاخیں قرار دیتا ہے جو ایک نظریئے وعقیدہ کی جڑ سے نکلی ہوں۔

انسان ارتقاء کی راہ پر ٹھیک اس قافلہ کی مانند ہے جو ایک متعین منزل کی طرف رواں دواں ہے لیکن اس منزل تک پہنچنے کے راستے سے وہ آگاہ نہیں ہے چند قدم چلنے کے بعد وہ کسی واقف راہ سے منزل کا پتہ پوچھتا ہے۔اس کی بتائی ہوئی نشانیوں کے مطابق کم و بیش دس میل کا راستہ طے کر لیتا ہے لیکن اب اس قافلے کو بھی پھر کسی رہنما کی ضرورت پیش آتی ہے اوہ وہ اس کی بتائی ہوئی علامات کے مطابق مزید دس میل کا سفر مکمل کر لیتا ہے۔اس طرح منزل کی طرف بڑھنے کی اس کی صلاحیت میں بتدریج اضافہ ہوتا رہتا ہے بالاخر اسے ایک ایسا شخص مل جاتا ہے جو اسے راہ سفر کا ایک مکمل نقشہ دے دیتا ہے اور قافلہ اس نقشے کے حاصل ہونے کے بعد کسی نئے رہبر کی ضرورت سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

قرآن نے یہ بات اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ انسان کی راہ تک متعین و مستقیم راہے اور تمام پیغمبران تمام اختلافات کے باوجود جو وہ زمان ومکان اور موقع محل کے مطابق انسانی معاشروں کی رہبری میں باہم رکھتے ہیں، وہ ایک ہی منزل اور ایک ہی شاہراہ کی جانب ان کی رہنمائی کرتے ہیں،اس طرح قرآن نے ختم نبوت کی راہ کو ہماری نگاہوں کے سامنے خوب روشن اوران عقیدے کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔عقیدۂ ختم نبوت اسی صورت میں معقول اور قابل فہم ہوسکتا ہے کہ تغیر اور ترقی پذیر انسان کی ارتقاء کی راہ متعین اور مستقیم ہو لیکن اس کے برعکس انسان دوڑ دھوپ میں ہو اور دوسرے لمحے اس کی راہ سفر تبدیل ہوتی رہے اور اس کے سر کا مقصد اور منزل تعین نہ ہو اور وقت کے ہر مرحلے میں وہ ایک دوسرا ہی راستہ اختیار کرے تو پھر ختم نبوت یعنی دائمی اور کلی لائحہ عمل اور نقشہ کار معقول اور قابل فہم نہیں قرار پاتا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ

---

[1] سورۂ انعام ۱۵۳.

شَهِيْدًا ؕ

ترجمہ:" اور اس طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امت وسط بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ اور رسول تم پر گوہ ہو۔" (سورہ آل عمران ۔ ۱۴۳)

قرآن کی رو سے امت مسلمہ ایک امت وسط ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ یہ امت ایسی تعلیمات کی پروردہ ہے جو توسط وتعادل کی حامل ہے۔قرآن کی یہ آیت ختمی امت اور ختمی تعلمیات کا ذکر صرف ایک کلمہ کے ذریعہ کر دیتی ہے اور وہ وسطیت وتعادل ہے۔

ہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تمام انبیاء کی تعلیمات میں وسطیت اور تعادل موجود نہیں رہا ہے۔اس سوال کے جواب میں کچھ کہنا ضروری ہے۔

اس روئے زمین پر انسان ہی ایک جاندار مخلوق نہیں ہے اور صرف وہی اجتماعی انداز میں زندگی بسر کرنے کا عادی نہیں ہے، دوسری جاندار مخلوقات بھی ہیں جو مقررہ معمولات، ایک خاص منظم اور ڈھانچے کے مطابق زندگی بسر کرتی ہیں انسان کے برعکس ان کی زندگی جنگل کے زمانے پتھر کے زمانے لوہے کے زمانے ایٹم کے زمانے سے آشنا نہیں ہے۔روز اول سے جب سے کہ وہ وجود میں آئی ہیں ان کی زندگی کا ایک ہی منظم ڈھانچہ ہے یہ انسان ہی ہے جو اس آیت قرآنی کے مطابق"

"وخلق الانسان ضعيفاً" 5

ترجمہ:" انسان کمزور طپیدا کی گیا ہے۔"

اپنی زندگی کا آغاز صفر سے کرتا ہے اور ترقی کے لامتناہی راستے پر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔انسان فطرت کا ایک ہونہار اور بالغ فرزند ہے اسی لئے اسے آزادی وخودمختاری حاصل ہے اسے کسی مستقل ناظم وسرپرست اور ایسی جبری ہدایت کی ضرورت نہیں جس پر عمل کرنے کے لئے کوئی پوشیدہ اندرونی قوت اسے مجبور کرے۔دوسرے جاندار جو کچھ جبلت کے سامنے سر جھکا کر انجام دیتے ہیں وہ انسان آزادانہ ماحول میں عقل وقانین کے مطابق انجام دیتا ہے:

"انا هدينه السبيل اما شاكراً و اما كفوراً" 6

ترجمہ:" ہم نے اسے راستہ دکھادیا خواہ شکر کرنے والا ہے یا کفر کرنے والا۔"

انسان میں انحراف وسقوط اور جمود وانحطاط پایا جاتا ہے جبکہ دوسرے جاندار ایک حالت پر قائی رہتے ہیں۔وہ اس بات پر قدرت نہیں رکھتے کہ سوچ سمجھ کر کہ خود آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں، سیدھی جانب کا رخ کریں یا بائیں سمت کا تیز چلیں یا آہستہ اس کے برعکس انسان اپنی عقل وشعور سے کام لے کر آگے بھی قدم بڑھا سکتا ہے پیچھے بھی ہٹ سکتا ہے وہ دائیں یا بائیں کسی بھی سمت مڑ سکتا ہے وہ تیز بھی

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

چل سکتا ہے اور آہستہ بھی وہ ایک بند ٭ شاکر بھی بن سکتے اہے اور سرکس کافر بھی۔ اس طرح وہ افراط وتفریط کے درمیان کھڑا نظر آتا ہے۔

انسانی معاشرہ کبھی اس طرح عادات کا اسیر اور جامد و ساکن ہو جاتا ہے کہ کوئی موثر طاقت ہی اس کی زنجیروں کو کاٹ کر اسے حرکت میں لا سکتی ہے۔ کبھی انسانی معاشرہ پر حرص وطمع اور نئی راہوں پر چلنے کی خواہش اس طرح مسلط ہو جاتی ہے کہ وہ فطرت کے اصول وقوانین تک کو بھلا بیٹھتا ہے اور کبھی وہ غرور وخود پرستی اور تکبر میں غرق ہو جاتا ہے، اسے خود بینی کی راہ سے ہٹا کر زہد و پرہیز گاری کی راہ پر ڈالنے کے لئے کسی اثر انداز ہونے والی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے حقوق کے ساتھ دوسروں کے حقوق کا بھی خیال رکھ سکے جب یہی انسانی معاشرہ آرام طلبی مادر پدر آزادی اور ظلم وستم کی راہ پر چل پڑتا ہے تو اس کے ضمیر کو جھنجھوڑنے اور اس میں حقوق کا شعور احساس کے پیدا کرنے کے سوا اور چارہ نہیں ہوتا۔

یہ بات واضح ہے کہ تیزی کے ساتھ پیش قدمی ہو یا سست روی بائیں جانب میلان ہو یا دائیں جانب ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک خاص لائحہ عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر معاشرہ کا انحراف دائیں جانب ہو تو اصلاح کرنے والی طاقت کو اسے بائیں جانب موڑنے کی کوشش کرنی ہوگی دوسری صورت میں اسے اس کے برعکس عمل کرنا ہوگا۔

ہی وجہ ہے کہ کسی ایک زمانے اور کسی ایک قوم کی اصلاح کے لئے کوئی تدبیر دوا کی حیثیت رکھتی ہے تو وہی تدبیر دوسرے دور اور دوسری قوم کے لئے ایک مرض مہلک میں مبتلا کرنے کا سبب بن سکتی ہے چنانچہ بظاہر مختلف انبیاء کے درمیان ایک اختلاف نظر آتا ہے کسی پیامبر (ص) کو جنگ کی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے تو کسی کو صلح کی کوئی نبی نرمی سے کام لیتا ہے تو کوئی سختی سے کسی پیغمبر کو انقلابی انداز میں کام کرنا پڑتا ہے تو کسی کو اعتدال وسلامتی کی راہ اپنانی پڑتی ہے۔ ایک پیغمبر کا سارا دور ابتلاؤ آزمایش سے بھرا ہوتا ہے تو دوسرے پیغمبر کے حصے میں فتح ونصرت بھی آتی ہے۔ انبیاء کے درمیان اختلافات کا تعلق ان کے اس روئے سے ہے جو وہ اپنے زمانے کے حالات کے پیش نظر اختیار کرتے ہیں ورنہ ہدف کے اعتبار سے ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے ہدف تمام انبیاء کا یک ہی ہے اور راستہ وہی صراط مستقیم ہے۔

قرآن کریم نے قصص انبیاء کے ضمن میں پوری طرح اس بات کی نشان وہی کی ہے کہ پیغمبروں میں سے ہر ایک مبداء و معاد سے متعلق اپنی مشترک تعلیمات کے تحت کسی ایک خاص نکتہ پر زور دیتا ہے وہ ایک مخصوص لائحہ عمل کے اجراء پر مامور ہوتا ہے یہ بات قصص قرآنی کے مطالعہ سے بخوبی روشن ہو جاتی ہے۔

مصلحین جب کسی تیزی سے آگے قدم بڑھانے والے یا پسماندہ معاشرہ میں دائیں یا دائیں جانب مائل معاشرہ میں ظہور کرتے ہیں اور اصلاح کا کام شروع کرتے ہیں تو وہ بھول جاتے ہیں کہ ایک متعین لائحہ عمل صرف ایک محدود مدت کے لئے قابل اجراء ہوتا ہے اور معاشرہ کسی بھی نوعیت کا ہو اسے راہ عدل پر لانے کے لئے اس سے زیادہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے جتنی کہ دوسری جانب سے اسے انحطاط وانحراف کی زاہ پر ڈالنے کے لئے کی جاتی ہے۔

ان توضیحات کے بعد ہم زیر نظر آیت کے مفہوم کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔

پیغمبر اسلام کی رسالت تمام دوسرے انبیاء کی رسالتوں سے ان معنوں میں فرق و امتیاز رکھتی ہے کہ اس کی حیثیت قانون کی ہے کسی وقتی لائحہ عمل کی نہیں انسانیت کے لئے آپ کا لایا ہوا اساسی قانون کسی ترقی پسند یا رجعت پسند یدہ دائیں بازو یا بائیں بازو کی جانب مائل معاشرہ کے لئے مخصوص نہیں ہے۔

اسلام ایک جامع اور ہمہ گیر نظام حیات ہے جو ہر موقع و محل کے لئے کارآمد اور زندگی کے تمام جزئی طریقوں پر حاوی ہے۔ انبیاء کسی ایک معاشرہ کے لئے مبعوث کئے جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس معاشرہ کے لئے ایک مخصوص لائحہ عمل لے کر آتے تھے۔ اسلام کی آمد کے بعد علماء اور امت مسلمہ کے دینی رہنماؤں کو بھی اسی طرح کام کرنا چاہیے جس طرح انبیاء نے انجام دیا تھا لیکن علماء و مصلحین اور انبیاء کے کام کے درمیان فرق یہ ہے کہ علماء وحی اسلام کے ابدی سرچشمے سے ہدایت حاصل کر کے ایک خاص لائحہ عمل وضع کرتے ہیں اور اس کے نفاذ کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن دوسری آسمانی کتابوں کی وقتی اور محدود تعلیمات کی روح اپنے اند لئے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن خود آسمانی کتابوں کا محافظ و نگہبان قرار دیتا ہے:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ 7

ترجمہ: " پھر اے نبی (ص) ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محفظ و نگہبان ہے۔"

اسلامی مخصوص سے یہ بات ثابت ہے کہ تمام انبیاء جو ایک کلی و خاتمی نبوت اور ایک اساسی قانون کے پیشرو کی حیثیت رکھتے ہیں اس بات کی پابند رہے ہیں کہ وہ اپنی اپنی امتوں کو ختم نبوت کے آخری دور میں دین کے اتمام و تکمیل کی خوشخبری دیں، اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں تمام پیغمبروں سے عہد و پیمان لیا ہے۔

نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں اس کا ذکر بڑی عمدگی کے ساتھ کیا گیا ہے:

ولم يخل سبحانه خلقه من نبى مرسل اور كتاب منزل اور حجه لازمه اور محجه قائمه رسل لاتقصير بهم قله عددهم و لا كثره المكذبين لهم و سلفت الاباء خلفت الابناء الى ان بعث الله محمدا رسول الله (ص) من سابق سعى كه من بعده اوغا بر بر عرفه من قبله على ذلك نسلت القرون و مضت الدهور لانجاز عدته و تمام نبوته ماخوذا على النبين، ميثاقه، مشهور سماته كريما ميلاده۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو کبھی کسی پیغمبر یا کسی کتاب آسمانی یا کافی دلیل یا کسی روش طریقے سے خالی نہیں رکھا ہے، پیغمبروں کو ان کی قلت تعداد اور ان کے مخالفین کی کثرت تعداد نے کبھی ادائے فض سے نہیں روکا، ہر پیغمبر اپنے

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

سے پہلے گزرنے والے پیغمبر سے پوری طرح متعارف رہا ہے اور خود اس کی آمد کی بشارت سابق پیغمبر کی زبانی لوگوں کو ملتی رہی ہے اسی طرح ایک نسل کے بعد دوسری نسل آتی رہی اور زمانہ گزرتا چلا گیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کے مطابق محمد (ص) کو سلسلہ نبوت کی تکمیل کے لئے بھیجا، اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے آپ کے بارہ میں پہلے ہی عہد و پیمان لے رکھا تھا۔ آپ کی نشانیاں مشہور و معروف ہو چکی تھیں اور آپ کی ولادت ایک ولادت عظیم تھی۔

اس بارے میں رسول اکرم (ص) کے دو بڑے عمدہ کلمے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

"نحن الاخرون السابقون یوم القیامه"

"ہم تمام پیغمبروں اور امتوں کے بعد دینا میں آئے ہیں لیکن آخرت میں ہم سب سے آگے ہوں گے اور سب ہمارے پیچھے آئیں گے۔"

آپ کا ایک دوسرا ارشاد یہ ہے:

"آدم و من دونه تحت للوئی یوم القیامه"

"قیامت کے دن تمام پیغمبر میرے پرچم تلے ہوں گے۔"

قیامت کے دن اس پیشروی اور پس روی اور رسول اکرم (ص) کے پرچم تلے تمام انبیاء کے ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ تمام انبیاء رسول اکرم (ص) کی بعثت کے لئے مقدمہ ہیں تو آپ نتیجہ سابق انبیاء پر جو وحی نازل ہوئی وہ ایک وقتی لائحہ عمل کے دائرہ تک محدود تھی اور رسول اکرم (ص) پر نازل ہونے والی وحی ایک کلی وابدی قانون اساسی کے لئے تھی۔ مسلمان بزرگوں نے رسول اکر (ص) کے ان دو عمدہ کلمات اور معارف اسلامی کے اس اصولسے ہدایت حاصل کرتے ہوئے کہ جو کچھ اس دنیا میں ظاہر ہوتا ہے اس دنیا کے واقعات کا ملکوتی ظہور ہے بڑی عمدہ اور دلپذ یر باتیں کہی ہیں:

و انی وان کنت ابن آدم صورة
فلی فیه معنی شاهد بأبوتی
و کلهم عن سبق معنای دائیر
بدائیرئی او وارد من شریعتی
و ما منهم الا و قد کان داعیا
به قومه للحق عن تبعیتی
و قبل فعالی دون تکلیف ظاهری
ختمت بشرعی المضحی کل شرعة

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

مولوی نے بھی یہی مضمون باندھا ہے:

ظاہراً آن شاخ اصل میوہ است
باطناً بھر ثمر شد شاخ
گر نبودی میل و امید ثمر
کی نشاندہی باغبان بیخ شجر
پس بمعنی آن شجر از میوہ زاد
گر بصورت از شجر بودش بار
مصطفیٰ زین گفت کارم و انبیاء
خلف من باشند در زیر لوا
بھر این فرمودہ است آن زد فنون
رمز نحن آلاخرون و السابقون
گر بصورت من ز آدم زادہ ام
من بمعنی جد جد افتادہ ام
پس ز من زائید در معنی پدر
پس ز میوہ زاد در معنی شجر
اول فکر آخر آمد در عمل
خاصہ فکری کو بود وصف ازل

شبستری کہتا ہے:

کی خط است از اول تابہ آخر
بر او خلق خدا جمل مسافر
در این رہ انبیاء چون سار بانند
دلیل و رہنمای کاروانند
و زیشان سید ماگشتہ سالار
ہم او اول ہم او آخر در این کا
احد درمیم احمد گشت ظاہر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

دراین دور اور آمد عین آخر
ز احمد تا احد یک میم فرق است
جھانی اندرین یک میم غرق است وَ
بر او ختم آمد پایان این راہ
بدو منزل شدہ ادعوا الی اللہ
مقام دلکشایش جمع جمع است
جمال جانفرایش شمع جمع است
شدہ اور پیش و دلہا جملہ در پی
گرفتہ دست جادہا دامن وی

قرآن کریم نے بعد میں آنے والے انبیاء (اور بدرجہ اولی خاتم انبیاء) پر سابق انبیاء کی جانب سے ایمان لانے ان کی نبوت کوتسلیم کرنے بلکہ ان کی آمد کو خوشخبری دینے کا اور ذمہ داری کا کہ وہ اپنی امت کو بھی ایسا کرنے کی ہدایت کریں اور انہیں بعد میں آنے والے انبیاء کی تعلیمات کو قبول کرنے کے لئے تیار کریں اور اسی طرح بعد میں آنے والے پیغمبروں کی جانب سے پیشرو پیغمبروں کی تائیدوتصدیق کا اور اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبروں سے اس خوشخبری اس تسلیم تائید تصدیق پر پختہ عہد لینے کا اس طرح ذکر کیا ہے:

"وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝٨١" 8

ترجمہ: "یاد کرو اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ" آج میں نے تمہیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے۔کل اگر کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس اس تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اس کی مدد کرنی ہوگی" یہ ارشاد فرما کہ اللہ نے پوچھا" کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو۔" انہوں نے کہا" ہاں ہم اقرار کرتے ہیں" اللہ نے فرمایا" اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گاوہ ہوں۔"

نبوتوں کا ایک رشتہ میں بندھا ہونا اور ایک نبوت کا دوسری سے مربوط ہوتے چلے جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ نبوت تکمیل کی جانب ایک تدریجی سفر ہے جس کا آخر حلقہ اس کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔عارفین اسلام کہتے ہیں:

"الخاتم من ختم المراتب باسرھا"

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

عنی پیغمبر خاتم وہ ہے جس نے تمام مراحل طے کر لیے ہیں اور وحی کی رو سے کوئی ایسی راہ باقی نہیں رہ گئی ہے جسے اس نے طے نہ کیا ہو اور کوئی ایسا نکتہ باقی نہیں رہ گیا ہے جس کی اس نے وضاحت نہ کی ہو۔ اگر ہم یہ فرضکر لیں کہ کسی علم سے متعلق تمام مسائل حل ہو چکے ہیں تو پھر اس شعبہ میں کسی نئی تحقیق یا کسی نئے انکشاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ وحی سے متعلق مسائل کا معاملہ بالکل ایسا ہی ہے۔ خدا کے آخری دستور کے آجانے کے بعد کسی نئے انکشاف اور کسی نے پیغمبر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ جو کچھ انسا پر منکشف ہوا ہے، اسے ایک ایسے کامل ترین مکاشفہ کی حیثیت حاصل ہے جو کسی انسا کے دائرہ امکان میں ہو سکتا ہے یہ بات واضح ہے کہ ایک ایسے مکمل مکاشفہ کے بعد دوسرا جو بھی مکاشفہ ہوگا، وہ دراصل پہلے سے طے کردہ راہ کی ہی ایک چیز ہوگی اس کے ساتھ کوئی نئی بات نہیں ہوگی، آخری بات تو وہی ہے جو اس کامل ترین مکاشفہ میں آچکی ہے:

"وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾" 9

ترجمہ: "تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

مرحوم فیض نے اپنی کتاب علم الیقین کے 10 پر کسی بزرگ کا قول نقل کیا ہے:

"انسانی فطرت کا ہدف و مقصود و قرب الٰہی کے مقام تک پہنچنا ہے اور پیغمبروں کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس اعتبار سے نبوت نظام زندگی کا ایک حصہ قرار پاتی ہے لیکن اس کا مقصود اور ہدف سب سے اونچا مرتبہ اور نبوت کا آخری درجہ ہے نہ کہ نبوت کا اولین درجہ، سنت الٰہی کے مطابق نبوت بتدریج درجہ کمال تک پہنچتی ہے جیسے کہ ایک عمارت بتدریج مکمل ہوتی ہے۔ عمارت کی تعمیر کا ہدف اس کے پایے اور دیواریں نہیں ایک مکمل مکان ہوتا ہے، نبوت کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے نبوت کا ہدف اس کی تکامل صورت ہے یہی وجہ ہے کہ نبوت کا سلسلہ ایک جگہ پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور مکمل ہو جاتا ہے۔

وہ مزید کسی اضافے کو قبول نہیں کرتا کیونکہ تکمیل کے بعد کوئی اضافہ وکمال کے منافی ہوتا ہے اور اس کی حیثیت ایک زائد انگلی کی سی ہو جاتی ہے، پیغمبر اکرم (ص) کی معروف حدیث میں اس جانب اشارہ کیا گیا ہے، آپ نے فرمایا نبوت ایک مکان کی مانند ہے جو تیار ہو چکا ہے لیکن اس کے مکمل ہوے میں سرف ایک اینٹ کی جگہ باقی رہ گئی ہے اس جگہ کو میں ہی بھرنے والا ہوں یا میں ہی اس آخری اینٹ کی جگہ باقی رہ گئی ہے اس جگہ کو میں ہی بھرنے والا ہوں یا میں ہی اس آخری اینٹ کا نصب کرنے والا ہوں!

ہم نے گذشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا ہے، وہ عقیدہ ختم نبوت کے پس منظر اور اس کی بنیادوں کی جانب رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

یہ بات واضح ہوگئی کہ انسانی فطرت میں دین کی طلب وہ بنیاد ہے جس پر عقیدۂ ختم نبوت استوار ہوتا ہے تمام انسانوں کی فطرت ایک ہے، تکمیل انسانیت کا سفر ایک با مقصد سفر ہے جو ایک متعین اور سیدھے راستہ جاری ہے۔ اس اعتبار سے دین حق، جو فطرت کے تقاضوں کی وضاحت کرتا ہے اور انسان کی راہ راست کی جانب رہنمائی کرتا ہے، صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ ایک طریق

زندگی جو انسانی فطرت کے مطابق ہو، جامع اور کلی ہو اور ہر طرح کی تبدیلی وتحریف سے محفوظ ہو اور جو مسائل کی اچھی طرح تشخیص کر سکے اور جسے اچھی طرح منطبق کیا جا سکے اور عمل ونفاذ کے مرحلے میں ہمیشہ رہنمائی کر سکے اور حالات کے مطابق مختلف طریقوں لائحہ عمل اور بے شمار جزئی قوانین کے لئے سرچشمہ ثابت ہو سکے انسانی فطرت کا ایک اہم تقاضا اور انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے آئندہ مضامین اس پہلو کو بہتر طریقے پر واضح کریں گے۔

اب ہم ان سوالات کا جواب تلاش کرتے ہیں جن کی طرف ابتدا میں اشارہ کیا گیا تھا۔

آسمانی دروازے

پہلا سوال جس کے سبب ختم نبوت کا عقیدہ وجود میں آیا وہ عالم غیب اور انسان کے درمیان رابطے سے تعلق رکھتا ہے وہ سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے دور کے انسان نے اپنی جہالت اور بے علمی کے باوجود وحی والہام کے راستے سے عالم غیب کے ساتھ کس طرح رابطہ پیدا کر لیا اور اس پر آسمان کے دروازے کیسے کھل گئے؟ جبکہ ترقی یافتہ بعد کا انسان اس رحمت سے محروم رہا اور اس پر آسمان کے دروازے بند ہو گئے۔

کیا فی الواقع انسان کی روحانی اور باطنی صلاحیتیں کم ہو گئی ہیں اور وہ اس اعتبار سے تنزل میں چلا گیا ہے۔

یہ شبہ اس خیال سے پیدا ہوا ہے کہ عالم غیب کے ساتھ معنوی ربط وتعلق انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے سلسلہ نبوت کے منقطع ہونے کا لازمی نتیجہ عالم غیب اور عالم انسانی کے درمیان روحانی اور معنوی رابطے کے انقطاع کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

لیکن یہ خیال اپنی کوئی بنیاد نہیں رکھتا۔قرآن کریم بھی غیب اور ملکوت کے ساتھ اتصال کے درمیان اور مقام نبوت کے درمیان لازم وملزوم کے تعلق کا قائل نہیں ہے جیسا کہ خرق عادت کو وہ پیغمبری کی واحد دلیل تسلیم نہیں کرتا، قرآن کریم ایسے اشخاص کا بھی ذکر کرتا ہے کہ ان کی معنوی زندگی ایسی طاقت سے بہرہ مند رہی ہے کہ انہوں نے فرشتوں کے ساتھ ہمکلامی کی ہے اور ان سے خارق العادت (غیر معمولی) امور انجام پائے ہیں حالانکہ وہ اشخاص نبی نہیں تھے۔اس کی بہترین مثال عمران کی بیٹی، عیسی مسیح (ع) کی ماں مریم ہے۔قرآن نے ان کے بارے میں حیرت انگیز واقعات کا ذکر کیا ہے۔قرآن موسیٰ (ع) کی والدہ کے بارے میں بھی کہتا ہے ہم نے اس کی طرف وحی بھیجی کہ موسیٰ (ع) کو دودھ پلائے اور جب اسے موسیٰ (ع) کے بارے میں کسی خوف کا احساس ہوا تو اسے دریا میں بہادے ہم اسے محفوظ رکھ کر تیری طرف واپس لوٹا دیں گے ہمیں معلوم ہے کہ عیسیٰ (ع) کی ماں پیغمبر تھیں اور نہ موسیٰ (ع) کی والدہ۔

حقیقت یہ ہے کہ ملکوتی حقائق کے غیب وشہود کے ساتھ اتصال، آواز غیبی کا سننا اور بالآخر غیب سے خبر کا پانا نبوت نہیں ہے، نبوت پیغام کا لانا ہے ہر دو شخص جسے غیب کی خبر مل جائے پیغام کا لانے والا نہیں ہوتا۔

قرآن اشراق اور الہام کا درازہ ان تمام لوگوں پر کھلتا ہے جو اپنے باطن کو پاک کر لیتے ہیں:

"اِنْ تَتَّقُوا اللہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا" 11

ترجمہ: "اگر تم خدا ترسی اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے لئے کسوئی بہم پہنچادے گا۔"

والذین جاھدو افینا لنھدینھم سبلنا 12

ترجمہ: جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے رستے دکھائیں گے۔

اسی فلسفہ کے نقطہ نظر سے معنوی اور عرفانی زندگی کا ایک نمونہ پیش کرنے کے لئے نہج البلاغہ کے ایک خطبہ کچھ حصہ یہاں نقل کرنا کافی ہوگا۔

نہج البلاغہ کے خطبہ ۲۲۰ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"ان اللہ تعالیٰ جعل الذکر جلاء للقوب تسمع بہ بعد الوقرۃ و تبصربہ بعد العشوۃ و تنقادبہ بعد المعاندۃ و ما برح للہ عزت آلائہ فی البرھۃ بعد البرھۃ و فی ازمان الفترات عبادنا جاھم فی فکرھم و کلمھم فی ذات عقولھم"

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد کو دلوں کا صیقل قرار دیا ہے۔ دل بہرے ہوجانے کے بعد بھی اس ذکر کے ذریعہ سننے والے اور اندھے ہوجانے کے بعد دیکھنے والے اور سرکشی وعناد کی راہ پر چل پڑنے کے بعد بھی مطیع وفرمانبردار ہو جاتے ہیں۔ ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے اور آج بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ زمانے کے ہر ایک حصے میں اور ان زمانوں میں جبکہ لوگوں کے درمیان کوئی پیغمبر موجود نہ ہو اللہ تعالیٰ کے ایسے بنے موجود رہے ہیں آج بھی ءموجود ہیں جن کے دلوں میں وہ کوئی راز کی بات ڈالتا رہا ہے اور ان کی عقلوں کی راہ سے ان کے ساتھ بات کرتا ہے۔"

رسول اکرم (ص) سے روایت ہے:

"ان للہ عباداً لیسوا بانبیاء یغبط ھم النبوۃ"

"اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے بھی موجود ہیں کہ وہ پیغمبر نہیں ہیں لیکن نبوت ان پر رشک کرتی ہے۔"

شیعہ ائمہ اطہار (ع) کی باطنی ولایت وامامت کے قائل ہیں جبکہ وہ انہیں نبی نہیں سمجھتے۔ اس سے بات بالکل واضح ہوجاتی ہے۔

عارفین اسلام نے عرفانی اصطلاحات میں معنی سیر وسلوک کے مراتب کو چار مرحلوں میں تقسیم کیا ہے ہم طول کلام سے بچنے کے لئے اس کے صرف دو مرحلوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

الف) سفر از خلق بہ حق (مخلوق کی طرف سے خالق کی جانب سفر)

ب) سفر حق بہ خلق (خالق کی طرف سے مخلوق کی جانب سفر)

مخلوق کی جانب سے خلاق کی طرف سفر پیغمبروں کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ پیغمبر تو معبوث ہی اسی لئے ہوئے ہیں کہ اس سفر میں انسان کی مدد کریں، جو کچھ پیغمبروں کے لئے مخصوص ہے، وہ خالق کی جانب سے مخلوق کی جانب سفر ہے یعنی وہ مخلوق کی دستگیری اور ارشاد ہدایت پر مامور ہیں اس سے مراد پیغمبر کی کثرت کی جانب واپسی ہے تا کہ اسے وحدت کی راہ دکھا سکے۔

صدر المتالھین 13 پر لکھتے ہیں:

" وحی یعنی پیغمبری اور منصب نبوت کے لئے قلب وسماعت پر فرشتے کا نزول منقطع ہو چکا ہے اور اب کسی شخص پر کوئی فرشتہ نازل مہیں ہوگا اور اسے کسی فرمان الٰہی کے جاری کرنے پر مامور نہیں کیا جائے گا، کیونکہ " اکلمت لکم دینکم " کے حکم کے تحت جو کچھ وحی کے راستے انسان تک پہنچتا تھا وہ پہنچ چکا ہے لیکن الہام واشراق کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا اس راہ کا مسدود ہونا ممکن نہیں۔"

اس سلسلے میں پہلے بہت کچھ کہا جا چکا ہے اس کا نقل مرنا موجب ظوالت ہوگا۔ ہمارے زمانے کے دانشمندوں میں سے عالمہ اقبال نے ایک بڑی لطیف بات کہی ہے۔ اقبال نے نبی اور عارف کے درمیان (ان کے قول کے مطابق مرد باطنی) فرق کو اس طرح واضح کیا ہے۔

ایک مرد عارف تجرنہ اتحادی (وصول بہ حق) سے حاصل کرنے والے اطمینان وسکون کے بعد حیات دنیوی کی جانب واپسی کو پسند نہیں کرتا۔ اگر وہ ضرورت کی بنا پر واپس بھی آتا ہے تو انسانیت کے لئے اس کی واپسی چنداں سودمند نہیں ہوتی لیکن خلق کی طرف پیغمبر کی واپسی ثمر بخش اور تخلیقی پہلو کی حامل ہوتی ہے۔ پیغمبر واپس آتا ہے اور وقت کے دھارے میں اتر جاتا ہے تا کہ تاریخ کے دھارے کو قابو میں لائے اور اس طرح کمال مقاصد سے ایک جہاں تازہ پیدا کرے۔ ایک مرد عارف کے لیے تجربہ اتحادی (وصول بہ حق) سے حاصل ہونے والا سکون ایک انتہائی مرحلہ ہے اور پیغمبر کے لئے اس کی روحانی قوت کا بیدار ہونا ہے جو ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ یہ قوت ایک ایسے اندازے کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے کہ عالم انسانی میں ایک مکمل انقلاب بر پا کر دیتی ہے پیغمبری کو ایک ایسی باطنی خود آ گاہی رکھنے والی نوع سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کی اس میں تجربہ اتحادی (وصول بہ حق) اپنی حدود سے باہر نکلنے کے قریب پہنچ جاتا ہے اور ایسے مواقع کی تلاش میں ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی کی طاقتوں کو از سر نو توجیہ کرے یا انہیں ایک تازہ شکل دے!

پس انقطاع نبوت سے مراد ارشاد وہدایتہ کے لیے خدا کی طرف سے ماموریت کا منقطع ہونا ہے۔ خدا کی طرف سفر کرنے والوں اور سالکوں کے لیے معنوی فیض کا منقطع ہونا نہیں۔

اگر ہم نے یہ گمان کیا کہ اسلام نے نبوت کے اعلان کے ساتھ معنوی زندگی کی بھی نفی کر دی ہے تو ہم سخت غلطی کریں گے۔

نبوت تبلیغی

دوسرا سوال یہ ہے کہ پیغمبران کرام بحثیت مجموعی دو بڑی ذمہ داریوں کو پورا کرتے رہے ہیں۔وہ خدا کی طرف سے انسان کے لیے قانون اور دستور العمل لاتے رہے ہیں وہ دوسرے یہ کہ وہ لوگوں کو خدا کی طرف بلانے کے ساتھ انہیں اس دور اور زمانے کے الہی دستور العمل پر کاربند ہونے کی دعوت دیتے رہے ہیں۔پیغمبروں کی اکثریت اسی دوسرے فریضے کے انجام دینے پر مامور رہی ہے۔ایسے پیغمبروں کی تعداد بہت کم ہے جن کو قرآن اولوالعزم قرار دیتا ہے اور جن کے ذریعے قانون اور دستور العمل بھیجا گیا ہے۔اس اعتبار سے نبوتیں دو قسم کی رہی ہیں ایک نبوت تشریعی اور دوسری نبوت تبلیغی .....تشریعی پیغبر جن کی تعداد بہت تھوڑی ہے وہ صاحب شریعت وقانون انبیاء کہلاتے ہیں جبکہ تبلیغی پیغمبروں کا کام صاحب شریعت پیغمبروں کی تعلیمات کو عام کرنا اور ان ہی کے مطابق تعلیم و ارشاد کا کام انجام دینا رہا ہے۔اسلام نے ختم نبوت کا اعلان کر کے نہ صرف تشریعی نبوت بلکہ تبلیغی نبوت کے سلسلے کو بھی ختم کر دیا ہے۔آخر ایسا کیوں کیا گیا؟امت محمد (ص) اور ملت اسلامیہکو پیغمبروں کے ہدایت وارشاد کے اس سلسلے سے کیوں محروم کیا گیا؟

بلفرض ہم نے یہ بات تسلیم کر لی کہ تکمیل اتمام اور جامعیت وکلیت کی بنا پر تسریعی نبوت کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا لیکن تبلیغی نبوت کے سلسلے کو کس حکمت وفلسفے کی بنا پر ختم کیا گیا؟

حقیقت یہ ہے کہ نبوت اور ہدایت وحی کی اصل ذمہ داری یعنی وہی پہلی ذمہ داری (تشریعی) ہے جبکہ تبلیغ تعلیم اور دعوت کی ذمہ داری (تبلیغی) نصف بشری ہے تو نصف الہی۔

وحی اور نبوت یعنی عالم وجود کی بنیادوں سے ایک پوشیدہ اتصال اور رابطہ اور مخلوق کی ہدایت کے لیے اس کی ماموریت در اصل مظاہر ہدایت کا ایک مظہر ہے جو سارے عالم وجود پر حکم فرما ہے۔

"الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَہَدٰی ۪ۙ﴿۳﴾ " 14

ترجمہ:" جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی۔"

موجودات زندگی کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس درجہ کمال کی مناسبت سے جس پر وہ پہنچ جاتے ہیں ہدایت خاص سے بہرہ مند ہوتے ہیں یعنی ہدایت کی شکل اور خصوصیت زندگی کے مختلف مراحل کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔تمام دانشور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ حیوانات اپنی ساخت کے وسائل طبیعی کے اعتبار سے ضعیف تر اور ناتوان تر ہیں لیکن وہ پوشیدہ جبلی رہنمائی کے اعتبار سے قوی تر ہوتے ہیں انہیں فطرت کی ایک مستقل سرپرستی اور حمایت حاصل رہتی ہے۔وہ جس قدر طبعی وسائل اور عقلی وہمی خیالی اور حسی طاقتوں سے لیس ہوتے چلے جاتے ہیں وجود کی سیڑھی پر ان کے قدم بلندی کی جانب اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ان کی جبلی ہدایت میں کمی آنے لگتی ہے۔ٹھیک اس بچہ کی طرح جو کمسنی کے ابتدائی مراحل میں ماں باپ اور دوسرے اشخاص کی مستقل سرپرستی اور نگرانی سے بہرہ ور رہتا ہے اور جس قدر وہ رشد وبلوغ حاصل کرتا جاتا ہے والدین کی مستقل نگرانی وسرپرستی کے دائرے سے باہر نکلتا چلا جاتا ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

جاندار مخلوقات کا زندگی کی سیڑھیوں پر چڑھ کر بلند ہونا اور ان کا عقلی وہمی خیالی حسی اور عضوی وسائل سے لیس ہونا ان کے استحکام واستقلال کو بڑھانا ہے اور اس اعتبار سے ان کی جبلی ہدایت کم ہو جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کیڑے دوسرے تمام حیوانات کی بہ نسبت جبلی ہدایت سے زیادہ لیس ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تکمیلی مراحل کے اعتبار سے سب سے نچلے درجہ میں ہیں اور انسان جو تکمیل کی سیڑھی کے سب سے اونچے پلہ پر پہنچا ہوا ہے تمام مخلوقات کی بہ نسبت جبلی ہدایت میں کمزور تر ہے۔

وحی ہدایت کے عالی ترین اور بلند ترین مراتب ومظہر میں سے ایک ہے۔ وہ اپنے اندر ایک ایسی رہنمائی رکھتی ہے جو حس خیال عقل علم اور فلسفہ کی دسترس سے باہر ہے ان میں سے کوئی چیز وحی کی جگہ نہیں لے سکتی لیکن وحی تشریعی ہی اس خصوصیت کی حامل ہے وحی تبلیغی نہیں وحی تبلیغی کا معاملہ دوسرا ہے۔

انسان اس وقت تک تبلیغی وحی کا محتاج رہتا ہے جب تک اس کی عقل علم اور تمدن کا فرجہ اس مقام تک بلند نہیں ہو جاتا کہ وہ خود اپنے دین کے بارے میں دعوت تعلیم تبلیغ تفسیر اور اجتہاد کا فرض انجام دے سکے علم اور عقل کا ظہور دوسرے الفاظ میں انسانیت کا رشد و بلوغ خود وحی تبلیغی کو ختم کر دیتا ہے اور علماء ان انبیاء کے جانشین قرار پاتے ہیں۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے قرآن نے اپنی نازل ہونے والی پہلی آیت میں پڑھنے لکھنے کی اور قلم وعلم کی بات کی ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝١ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝٢ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝٣ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝٤ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝٥ "15

ترجمہ:" پڑھو (اپنے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔"

یہ آیت اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ قرآن کا عہد پڑھنے لکھنے سکھانے کا اور علم وعقل کا عہد ہے۔ یہ آیت ہمیں اشارتاً بتاتی ہے کہ قرآن کے اس دور میں تعلیم تبلیغ اور آسمانی آیات کی حفاظت کی ذمہ داری علماء کی طرف منتقل کر دی گئی ہے اور علماء اس اعتبار سے انبیاء کے جانشین قرار پاتے ہیں۔ اس آیت نے اس عہد میں بشریت کے استقلال اور بلوغ کا اعلان کیا ہے۔ قرآن نے اپنی تمام آیات میں تدبر عقلی استدلال فطرت کے تجرباتی وعینی مشاہدہ تاریخ کے مطالعہ اور گہرے غور وفکر کی دعوت دیتا ہے یہ سب ختم نبوت کی اور وحی تبلیغی کی جگہ علم وعقل کے جانشین ہونے کی نشانیاں ہیں۔

قرآن کے لیے جس قدر کام ہو چکا ہے کیا کسی دوسری آسمانی کتاب کے لیے اس قدر کام انجام دیا گیا ہے؟ نزول قرآن کے ساتھ ہی قرآن کے ہزاروں حافظ پیدا ہو گئے۔ نزول قرآن کو ابھی نصف صدی بھی نہیں گزری تھی کہ علوم قرآنی کی خاطر نحو

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

وصرف قواعد زبان اور عربی زبان کی لغات کی تیاری کا کام شروع ہو چکا تھا۔ معانی بیان اور بدایع کا علم ایجاد ہوا ہزاروں تفسیریں اور ان کے مفسرین تفسیر قرآن کی درسگاہیں وجود میں آ گئیں۔ قرآن کے لفظ لفظ کے بارے میں تحقیق کا کام ہونے لگا اس کام زیادہ حصہ ان لوگوں کے ہاتھوں انجام پاتا رہا جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے۔ صرف یہ قرآن سے متعلق خاطر ہی رہی ہے جس نے اس قدر جوش وجذبہ پیدا کر دیا۔ یہ ساری سرگرمیاں آخر توریت انجیل اور اوستا کے لیے کیوں ظاہر نہیں ہوئیں کیا خود یہ بات بشریت کے رشد و بلوغ اور کتاب آسمانی کی تبلیغ وحفاظت اس کی صلاحیت پر دلالت نہیں کرتی؟ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ عقل و دانش نبوت تبلیغی کی جانشین بن گئی ہے۔

انسان اپنے ابتدائی دور میں مکتب کے اس کمسن بچے کی طرح تھا جو چندروز بعد ہی اپنی کتاب کو پھاڑ کر پھینک دیتا ہے اس کے برعکس عہد اسلامی کا انسان ایک بزرگ عالم کی طرح ہے کہ وہ جس قدر اپنی کتابوں کا بار بار مطالعہ کرتا ہے اسی قدر ان کے مضمین اسے یاد ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ ان کی گہرائی میں اترتا چلا جاتا ہے۔

انسانی زندگی کو بالعموم عہد تاریخ اور تاریخ سے پہلے کے عہد کے دوادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ تاریخ کا عہد اس دور کو کہا جاتا ہے جس میں انسان اپنی یادداشتوں کو کتبوں اور کتابوں کی صورت میں محفوظ کرنے کے قابل ہو گیا تھا اس دور کی زندگی کے بارے میں ان ہی یادداشتوں کو فیصلہ کن قرار دیا جاتا ہے لیکن ماقبل تاریخ کے عہد کے ایسے کوئی آثار موجود نہیں ہیں جو اس زمانے کی زندگی کے بارے میں فیصلے کی بنیاد بن سکیں۔

لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ عہد تاریخ کے آثار بھی زیادہ تر پراگندہ اور منتشر ہیں، البتہ اس عہد کا وہ آخری حصہ ظہور اسلام کے دور سے پوری طرح متصل ہے جس میں انسان نے پانی تاریخ اور آثار کو منظم طریقے پر نسل بہ نسل منتقل کرنا شروع کر دیا تھا خود اسلام کو اس رشد عقلی کا ایک بڑا عامل سمجھا جاتا ہے۔ عہد اسلامی میں مسلمانوں نے خود اپنے آثار کی حفاظت ونگہداشت کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ مسلمانوں نے پچھلی قوموں کے آثار کی بھی کم وبیش حفاظت کی اور انہیں بعد کی نسلوں کی طرف منتقل کرتے رہے۔ یہ ختم نبوت کا قریبی زمانہ ہی ہے کہ جس میں انسان نے اپنے علمی اور دینی ورثوں کی کی حفاظت کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ امر واقع یہ ہے کہ حقیقی عہد تاریخ ظہور اسلام کے عہد سے بالکل متصل ہے، گذشتہ ادوار میں ایک طرف نفیس علمی، فلسفی، اور دینی آثار ہوا اور دوسری طرف یہ آثار آب وآتش کے نذر بھی ہوتے رہے، تاریخ میں اس کی دردناک تفصیلات پوری طرح محفوظ ہیں۔

اسکندریہ کا عظیم مشرق روم کی شہنشاہیت پر مسیحیت کے اثر ورسوخ کے بعد تباہ ہو گیا اور اس مرکز تاریخی کتب خانہ متعصب عیسائیوں کے ہاتھوں نذر آتش ہو گیا!

علم کے ظہور اور ترقی کے ایک ایسے درجے تک انسان کی رسائی نے کہ وہ دین آسمانی کا محافظ، داعی اور مبلغ بن سکے، نبوت تبلیغی کی ضرورت باقی رہنے نہ دی اور اس کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اکرم (ص) نے اس امت کے علماء کو انبیاء بنی اسرائیل کی مانند کہا ہے۔

علامہ اقبال نے ایک بڑی عمدہ بات کہی ہے۔

" پیغمبر اسلام دنیائے قدیم جدید کے درمیان کھڑے ہیں۔الہام کے سرچشمے سے جب آپ کا رشتہ جوڑا جاتا ہے تو دنیائے قدیم سے آپ کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور جب روح الہام کو بروئے کار لایا جاتا ہے تو دنیائے جدید سے آپ کا ربط ہو جاتا ہے۔زندگی نے آپ کی ذات میں معرفت کے وہ دوسرے سرچشمے دریافت کر لئے ہیں جو اس (زندگی) کے نئے سفر کے لیے موزون ہیں۔اسلام کا ظہور دراصل استدلالی اور استقرائی عقل کا وجود میں آنا ہے۔ظہور اسلام کے ساتھ رسالت، خود نبوت کے اختتام پذیر ہونے کی ضرورت کے نتیجے میں، حد کمال کو پہنچ جاتی ہے جس سے لازماً یہ دانش مندانہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زندگی ہمیشہ، کمسنی کے مرحلے میں اور باہر سے رہنمائی کی محتاج نہیں رہ سکتی۔اسلام میں کاہنی (فالگیر) اور موروثی سلطنت کی نفی اور قرآن میں عقل اور تجربہ پر دائمی توجہ اور اس کتاب مبین کا فطرت اور تاریخ کو معرفت بشری کے سرچشموں کی حیثیت دنیا دراصل ختم نبوت کے واحد عقیدے کے مختلف خدوخال ہیں۔عقیدۂ ختم نبوت کے یہ معنے نہیں لینے چاہیں کہ زندگی کی انتہائی سرنوشت یہ ہے کہ عقل کامل جزبات واحساسات کی جگہ حاصل کر لے، یہ بات نہ ممکن ہے اور نہ مطلوب"

اسلام نے اعلان ختم نبوت کے ضمن میں اپنی ابدیت کا اعلان کیا ہے:"**حلال محمدٍ حلال الی یوم القیامہ و حرام محمد حرام الی یوم القیامة**"

ترجمہ:" محمد کا حلال کیا ہوا قیامت تک حلال ہے اور محمد (ص) کا حرام کیا ہوا قیامت تک حرام ہے"

سوالات اور اعتراضات کی ساری بوچھاڑ اسی موضوع سے ہے کہا جاتا ہے کیا کسی چیز کے لیے ہمیشگی ممکن ہے؟

دنیا میں ہر چیز فانی ہے، اس دنیا کی اصل بنیاد تغیر ہے، دنیا میں سرف ایک ہی چیز جاودانی ہے اور وہ یہ کہ کسی چیز کو ہمیشگی حاصل نہیں۔

ہمیشگی اور ابدیت کے منکر کبھی اپنی باتوں کو فلسفہ کا رنگ دے دیتے ہیں اور دلیل میں تغیر و تبدل کے اس قانون کو پیش کرتے ہیں جو فطرت کا ایک مجموعی قانون ہے۔

اگر ہم مسئلے پر اس نقطہ نظر سے غور کریں تو اعتراض کا واضح جواب مل جاتا ہے کہ وہ چیز جو ہمیشہ تغٰر و تبدل سے دو چار رہتی ہے وہ مادہ اور دنیا کی مادی ترکیبات ہیں لیکن قوانین اور نظامات خواہ وہ طبیعی نظامات ہوں یا وہ اجتماعی نظامات جو طبیعی اصولوں سے ہم آہنگ ہوں اس قانون تغیر و تبدل کے تحت نہیں آتے، ستارے اور شمسی نظامات ظاہر ہوتے ہیں اور چند دنوں بعد فرسودہ اور فانی ہو جاتے ہیں لیکن قانون کشش اپنی جگہ رہنا ہے، نباتات اور حیوانات وجود میں آتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں لیکن قوانین حیات باقی رہتے ہیں۔

ہی حال انسانوں اور ان کی زندگی کے قابون کا ہے، انسان جن میں پیغمبر بھی شامل ہے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں لیکن پیغمبر کا لایا ہوا آسمانی قانون زندہ اور تابندہ رہتا ہے۔

مصطفیٰ را وعدہ داد الطاف حق

گر بمیری تو نمیرد این سبق

مظاہر فطرت تغیر پذیر ہیں قوانین فطرت کو تغیر نہیں، اسلام قانون ہے نہ کہ مظاہر کائنات سے ایک مظہر اسلام اسی صورت مین مردہ ہوسکتا ہے کہ وہ قوانین فطرت سے ہم آہنگ نہ ہولیکن جب اسلام کا اپنا دعویٰ ہے کہ وہ فطرت اور انسانی سرشت سے اور اس کے معاشرے سے تازگی اور قوت حاصل کرتا ہے اور قوانین فطرت سے ہم آہنگ ہے تو آخر وہ کس طرح ہوسکتا ہے؟

کبھی اجتماعیت کے پہلو سے اعتراض کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اجتماعی ضوابط اجتماعی تقاضوں کی بنیاد پر وضع کئے جاتے ہیں، جب معاشرہ کی ضروریات قوانین اجتماعی کی بنیاد ہیں تو ان کا عوامیل تمدن کی توسیع وتکمیل کے ساتھ ساتھ متغییر ہونا بھی ضروری ہے ہر زمانے کی ضروریات دوسرے زمانے کی ضروریات سے مختلف ہوتی ہیں، میزائیل طیاروں بجلی اور ٹیلی ویژن کے اس جدید دور کی ضروریات گھوڑوں، خچرون اور اونٹون کی پرانے کی ضروریات سے قطعی مختلف ہون گی، یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس جدید دور کے لیے بھی وہی ضوابط نافذ ہوں جو پرانے زمانے میں رائج تھے، دوسرے الفاظ میں عوامل تمدن کے اندر ترقی وتوسیع لازمانئے تقاضے پیدا کرے گی، اس لیے جبر تاریخ کا راستہ روکنا اور زمانہ کے ایک ہی حال پر رکھنا ممکن نہیں ہے اور زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کرنا بھی ممکن نہیں ہے، جامد اور یکساں ضوابط کا پابند رہنا مقتضیات زمانہ کے ساتھ مطابقت اور لچک پیدا کرنے اور تمدن کے قافل کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

بے شک اہم ترین مسئلہ ہے، ہماری نئی نسل بجز تغیر وتبدل اور وجدت طلبی اور زمانے کے نئے نئے تقاضوں کے کچھ نہیں سوچتی، نئی نسل کا سامنا کرتے بھی جو بات سب سے پہلے کانون تک پہنچتی ہے وہ یہی ہے، اس نسل کی انتہا پسندوں کے نقطہ نظر سے مذہب اور نوطلبی دو متضاد وجود ہیں، نوطلبی کی خاصیت حرکت اور ماضی سے منہ موڑنا ہے جبکہ مذہب کی خاصیت جمود وسکون، ماضی سے وابستگی اور موجودہ وضع کی حفاظت کرنا ہے۔

اسلام کو دوسرے ہر مذہب سے زیادہ اس طرز فکر کے حامل گروہ سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے، اسلام کا ابدیت وہیشگی کا دعوی اس گروہ کے لیے بڑا ناقابل برداشت ہے، اسلام زندگی کے تمام شعبون میں عمل دخل رکھتا ہے، خدا اور بندے کے درمیان تعلق سے لے کر افراد کے اجتماعی روابط، خاندانی روابط، فرد اور اجتماع کے روابط انسانا اور اس دنیا کے باہمی روابط سب ہی سے وہ بحث کرتا ہے، اگر اسلام دوسرے مذاہب کی طرح چند مسلم عبادات اور خشک اخلاقی ضوابط تک محدود ہوتا تو پھر اس کے لیے کوئی دشواری نہ تھی لیکن وہ اس قدر مدنی، فوجداری، دیوانی، سیاسی، اجتماعی اور خاندانی قوانین وضوابط رکھتے ہوئے کیا کرسکتا ہے؟

ہم نے اوپر جو اعتراض نقل کیا ہے اس میں جبر تاریخ ضروریات میں تغیر مقضیات زمانہ کی رعایت جیسے نکات کو اٹھایا گیا ہے اس لیے اعتراض کے ان تین اصل نکات پر مختصراً، بحث کرنا ضروری ہے، اس کے بعد اسلام کے نقطہ نظر سے ہم اس اعتراض کو رفع کرنے کی کوشش کریں گے، ان محدود صفحات مین بحث کے تمام پہلووں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے، ایک ایسا مسئلہ جو فلسفہ، فقہ، تاریخ

اوراجتماعیات سب ہی سے متعلق ہے ایک ضخیم کتاب کی وسعت چاہتا ہے جسے برسون کے مطالعہ کا حاصل قرار دیا جاسکے تاہم توقع ہے کہ یہ مختصر مقالہ اس اشکال کے رفع کرنے میں مدد دے گا۔

جبر تاریخ

یہ کلمہ دو اجزاء سے مرکب ہے۔ جبر اور تاریخ جبر کا مطلب کسی چیز کا حتمی اور یقینی ہونا ہے فلاسفہ کی اصطلاح میں اسے ضرورت اور وجوب کہا جاتا ہے مثلا: جب ہم ۵×۵ کہتے ہیں تو یہ ضرب کھانے والے دونوں اعداد ضرورتا اور جبرا ۲۵ کے مساوی ہوں گے یعنی حتما ایسا ہی ہے اس کے خلاف ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ جبر کا لفظ اصطلاحا ایک فلسفیانہ مفہوم رکھتا ہے۔ اس سے ہٹ کر جبر کا مفہوم حقوقی فقہی اور عرفی ہے یعنی یہ لفظ اکراہ اور جبریہ ارمال کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۵×۵ اپنی ذاتی ساخت کی بناء پر ۲۵ کے مساوی ہے یہ کسی جبری قوت اور جبریہ عمل کی وجہ سے نہیں ہے لیکن تاریخ، تاریخ یعنی حادثات کا مجموعہ جو انسان کی سرگذشت کو تشکیل دیتا ہے۔ انسانی سرگذشت ایک راستہ طے کرتی ہے کچھ ایسی طاقتیں کارفرما ہیں جو اسے حرکت میں لاتی ہیں اور اسے قابو میں رکھتی ہیں جیسے ایک دستی پہیہ یا ایک کارخانہ جسے ہاتھ یا بھاپ کی طاقت سے چلایا جاتا ہے۔ تاریخ کو بھی کچھ عوامل اور طاقتیں حرکت میں رکھتی ہیں۔ اسے گردش میں لاتی ہیں اور آگے بڑھاتی ہیں۔ اس اعتبار سے جبر تاریخ، کا مطلب سرگذشت بشر کا حتمی اور پابند ہونا ہے، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تاریخ کی حرکت جبری ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی میں کچھ ایسے طاقتور عوامل ہیں جو اپنے قطعی اثرات رکھتے ہیں۔ ان سے بچنا ممکن نہیں ان عوامل کی تاثیر یقینی اور حتمی ہوتی ہے۔

جبر تاریخ، کے کلمے نے ہمارے اس دور میں بڑی قدر و قیمت حاصل کر لی ہے یہ کلمہ موجودہ زمانے میں وہی کردار ادا کر رہا ہے جو اس نے ماضی میں قضا و قدر کے پردہ میں ادا کیا تھا۔ حوادث زمانہ کے آگے سپر ڈال دینا اور اپنے غلطیوں کے عذر تراشنا اس کا مدعا ہے۔

یہ ایک شیر خونخوار ہے کہ اس کے مقابل تسلیم و رضا کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ماضی میں اس کا نام قضا و قدر تھا اور موجودہ دور میں اسے جبر تاریخ کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نقضا و قدر اور جبر تاریخ دونوں کلمہ صحیح فلسفیانہ مفہوم کے حامل ہیں۔ ان کے حقیقی مفہوم کو نہ سمجھنا ہی غلط تعبیر کا سبب بنا ہے ہم نے اپنی کتاب "انسان و سرنوشت: میں قضاء و قدر کے بارے میں بحث کی ہے لیکن جبر تاریخ، یہ کہ انسانی سرگذشت دنیا کے تمام حوادث کی طرح نہ تبدیل ہونے والا قانون رکھتی ہے اور تاریخی عوامل دوسرے تمام عوامل کی طرح قطعی اور لازمی تاثیرات رکھتے ہیں، یہ کوی ایسی بات نہیں ہے۔ قرآن کریم نے خود سنۃ اللہ کہہ کر اس کی تائید کی ہے لیکن ان عوامل کی تاثیر کی نوعیت اصل مسئلہ ہے۔ کیا تاریخ کے جبری عوامل کا اثر اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ ہر چیز وقتی محدود اور زوال پذیر ہو کر رہ جاتی ہے یا اس کی کوئی دوسری صورت بھی ہے؟

ظاہر ہے اس مسئلہ کا تعلق عوامل کی نوعیت سے ہے ۔ اگر تاریخ کو گردش میں لانے والے عوامل مضبوط اور پائیدار ہوں گے تو ان کی جبری تاثیر کا نتیجہ اس شکل میں ظاہر ہوگا کہ وہ گردش وتسلسل کو برقرار رکھیں گے ۔ اگر اس کے برعکس یہ عوامل ناپا۴دار عامل کا تعلق خاندان کی تشکیل رفیق زندگی کے انتخاب اور بچوں کی تولید میں موثر رہا ہے ۔ تاریخ کے طویل دور میں خاندانی زندگی کے خلاف تحریکیں اٹھتی رہیں لیکن وہ سب ناکام ہوگئیں ۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ تحریکیں جبر تاریک کے خلاف تھیں، جبر تاریخ کا تقاضا یہ تھا کہ خاندانی زندگی باقی رہے ۔

ایک دوسرا تاریخی عامل مذہب ہے ۔ پرستش انسان کی سرشت میں شامل ہے یہ کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی ہے ۔ یہ عامل تاریخ کے تمام ادوار میں موثر رہا ہے اور اس نے مذہب پر سے توجہ کو ہٹنے نہیں دیا ۔

غرض یہ کہ جبر تاریخ کو کسی محدود اور وقتی چیز کے مساوی قرار دے کر ہر قانون اور قائدہ کی ناپائیداری پر دلیل لانا ایک بڑی غلطی ہے ۔ جبر تاریخ، اس جگہ ناپائیداری کو نتیجہ کی صورت میں سامنے لاتی ہے جہاں زیر نظر عامل، جیسے اقتصادی پیداوار کا عامل ہو اور کوئی دوسرا عامل اس کی جگہ لے اس لئے انسان اور اس کی ضرورت تاریخ کو گوشنز د میں لانے والے عوامل اور ان میں سے ہر عامل کی معاشرہ پر اثر انداز ہونے والی تاثیری قوت کا سراغ لگانا چاہئے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا اثر کہاں تک پہنچتا ہے اور ان میں سے کونسا عامل مضبوط و پائدار ہے اور کونسا کمزور و ناپائیدار ۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی جملہ حالتوں کی ناپائیداری کو جبر تاریخ کے مساوی قرار دینے کا مفروضہ ہی انسان کے " یک جہتی" ہونے کے مفروضے کو آگے لانے کا سبب بنا ہے اس مفروضے کے مطابق" یک جہت" انسان زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتا اور تاریخ کا تغیر ایک" یک شاخہ" تغیر ہے ۔ اس مفروضے کے حامیوں کے نقطہ نظر سے ہر دور میں تاریخ کا اصلی اور بنیادی عامل معشیت ہے دولت کی پیداوار اور تقسیم کا طریقہ، افراد کے اقتصادی روابط جیسے کارخانہ اور مزدور کے روابط، کسان اور زمیندار کے روابط جو کمزور اور تغیر پذیر روابط ہیں، زندگی کے دوسرے گوشوں مثلا دین علم، فلسفہ، قانون، اخلاق اور ہنر کا تعین کرتے ہیں ۔ ابتدا" دنیا میں اس مفروضے کا بڑا چرچا ہوا لیکن اب یہ اپنی قدر و قیمت کھو چکا ہے ۔ آج دنیا اور تاریخ کے بہت سے مادہ پرست مفسرین اس مفروضے کو مسترد کر چکے ہیں ۔

ہر چند کہ ابھی علمی اعتبار سے قطعی طور ہر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انسان" یہ ناشنوا ساو جود" کثیر الجہت ہے اور انسانی تاریخ کی توجیہ کثیر الجہت، کے مفروضے سے ہی کی جاسکتی ہے البتہ یہ تسلیم شدہ قدر ہے انسان" یک جہت" نہیں ہے ۔ اس کے یک جہت ہونے کا نظریہ اور انسانی تاریخ کے سفر کا یک خطی ہونے کا مفروضہ سب سے زیادہ بے بنیاد بے بنیادمفروضہ ہے ۔

حوالہ جات

5.سورۂ نساءآیت ۲۸.

6.سور※ دہر آیت ۳.

7.سور※ مائدہ آیت ۴۸.

8.سور※ آل عمران آیت ۸۱.

9.سورہ انعام، آیت ۱۱۵.

10.فیض کاشانی، علم الیقین، صفحہ ۱۰۵.

11.سور※ انفال۔ آیت ۲۹.

12.سور※ عنکبوت آیت ۶۹.

13.صدر المتالھین شیرازی، مفاتیح الغیب، صفحہ ۱۳.

14.سور※ اعلیٰ آیت ۱۔۳.

15.سور※ علق آیت ۱۔۵.

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

انسانی ضروریات

کیا یہ درست ہے کہ انسان کی تمام ضروریات بدلتی رہتی ہے اور ضروریات کے تغیر کے ساتھ ان سے متعلق قوانین وضوابط میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے؟ اس کا جواب یہ کہ نہ تمام انسانی ضروریات حالت تعغیر میں ہوتی ہیں اور نہ ضروریات کے تغیر کا لازمی نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ زندگی کے بنیادی اصول اور ضوابط ہی میں تبدیلی آجائے۔

ضروریات کی پہلی قسم ضروریات دو طرح کی ہیں: بنیادی ضروریات اور ثانوی ضروریات، بنیادی ضروریات انسان کی جسمانی و روحانی ساخت اور اجتماعی زندگی کے مزاج کی گہرائیوں سے تعلق رکھتی ہیں جب تک انسان اس دنیا میں موجود ہے اور اجتماعی زندگی بسر کر رہا ہے اس کی یہ ضروریات باقی رہیں گی۔ یہ ضروریات تین طرح کی ہیں" جسمانی" روحانی اور اجتماعی:

۔جسمانی ضروریات کا تعلقات خوراک، پوشاک، مسکن اور رفیق حیات سے ہے۔

۔روحانی ضروریات کے ذیل میں علم، زیبایش، نیکی، پرستش، احترام وتربیت آتے ہیں اور

۔معاشرت مبادلہ اشیاء، تعاون، عدالت، آزادی اور مساوات کا تعل قاجتماعی ضروریات سے ہے

ثانوی ضروریات وہ ضروریات ہیں جو بنیادی ضروریات سے پیدا ہوتی ہیں مختلف آلات اور وسائل زندگی کی ضروریات اسی نوع کی بنیادی ضروریات سے پیدا ہوتی ہیں جو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی ضرورت ہے تو خدا کے ساتھ انسان کے رابطے یا فطرت کے ساتھ رہتی ہیں۔

یہ بنیادی ضروریات ہی جو انسان کو زندگی کی توسیع اور ترقی کی جانب قدم بڑھانے کے آمادہ کرتی ہیں ثانوی ضروریات زندگی کی توسیع وترقی سے پیدا ہوتی ہیں اور زیادہ سے زیادہ توسیع وترقی کے لئے محرک ثابت ہوتی ہیں۔

ضروریات میں تغیر اور ان کے نئے ہونے اور پرانے ہونے کا تعلق ثانوی ضروریات سے ہے بنیادی ضروریات نہ پرانی ہوتی ہیں اور نہ ختم ہوتی ہین وہ ہمیشہ زندہ اور نئی رہتی ہیں

ثانوی ضروریات کا ایک حصہ بھی ایسا ہی ہے قانون کی ضروریات ثانوی ضروریات کے اسی حصے سے تعلق رکھتی ہے ۔قانون کی ضروریات اجتماعی زندگی کی بنیادی ضرورت کا ایک لازمی لازمی نتیجہ ہے اور اسے بھی دوام اور ہیشگی حاصل ہے۔انسان کسی دور میں بھی قانون سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

ضروریات کی دوسرے قسم یہ بات صحیح ہے کہ تمدن کے عوامل میں توسیع نئینئی ضروریات کو سامنے لاتی ہے اور وقتا فوقتا فرعی قوامین ضوابط ومعاہدات کا ایک سلسلہ وجود میں آتا رہتا ہے مثلاً حمل ونقل کے مشینی وسائل کی بنا پر یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ شہروں کے درمیان آمدورفت کے لئے اور مختلف ممالک کے درمیان سفر اور حمل ونقل کے لئے کچھ قوانین وضوابط وضع کئے جائیں جبکہ ماضی میں اس طرح کے قوانین اور معاہدوں کی ضرورت نہیں تھی البتہ تمدن کے عوامل میں توسیع حقوقی، تعزیری اور شہری قوانین

جن کا تعلق لین دین، وکالتوں، ناجائز قبضوں، ضمانتوں، وراثت، ازدواج اور ایسے ہی دوسرے امور سے ہوتا ہے۔ اگر وہ فی الواقع عدالت اور فطری حقوق پر مبنی ہوں تو انہیں تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جب یہاں سان کے رابطے سے متعلق قوانین کی تبدیلی کا سوال کیسے پیدا ہوگا۔

قانون ضروریات کی تکمیل کا شریفانہ اور عادلانہ طریقہ مقرر کرتا ہے وسائل و آلات ضرورت کی تبدیلی ان کے حصول و استفادہ اور ان کے عادلانہ تبادلے کے طریقے کو تبدیل کرنے کا سبب نہیں بنتی۔ مگر یہ فرض کر لیا جائے کہ زندگی کے اسباب وسائل اور آلات میں تبدیلی آتی ہے اور وہ ترقی و کمال کی صورت اختیار کرتے ہیں تو حق" انصاف اور اخلاق کا مفہوم بھی بدل جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم کو یہ فرض کرنا پڑے گا کہ حق، عدالت اور اخلاق کے مفاہیم اضافی ہیں۔ ایک چیز اگر کسی زمانے میں حق عدالت اور اخلاق کے ذیل میں آتی ہے تو دوسرے زمانے میں وہ حق، عدالت اور اخلاق کے خلاف سمجھی جاتی ہے۔

ہمارے دور میں اس مفروضے کا بڑا چرچا ہے لیکن اس سلسلہ بیان مین اس مسئلہ پر بحث کی زیادہ گنجائش نہیں ہے یہاں ہم صرف یہ کہیں گے کہ اس مفروضے کا سبب حق، عدالت اور اخلاق کے حقیقی مفہوم سے ناواقفیت ہے۔ حق عدالت اور اخلاق کے ذیل میں جو چیز تغیر پذیر ہے وہ ان کا نفاذ اور ان کی عملی صورت ہے نہ کہ ان کی حقیقت و ماہیت۔ اگر کوئی آئیں و دستور حقوق اور فطرت کی بنیادس پر بنایا گیا ہو تو وہ ایک زندہ انقلابی قوت سے بہرہمند ہوگا وہ زندگی کی اس شکل و سورت سے بحث کرنے کی بجائے جس کا تعلق بظاہر تمدن سے ہے، زندگی کے لئے اصلی اور حقیقی خطاط کھیچے گا۔ وہ نہ صرف زندگی کے تغیرات سے ہم آہنگ ہوگا بلکہ ان کی رہنمائی کرے گا۔ نئی نئی ضروریات اور قوانین کے درمیان تضاد اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ قانون حرکت و عمل کی راہ متعین کرنے کے بجائے زندگی کی ظاہری شکل و صورت پر توجہ دے مثلاً مخصوص آلات اور وسائل کو جن کا تعلق سارے کا سارا تہذیب و تمدن کے مراحل سے ہوتا ہے انہیں ہمیشہ ایک ہی صورت میں رکھنا چاہئے۔

اگر قانون یہ چاہے کہ ہمیشہ تحریری کام ہاتھ ہی سے کیا جائے گھوڑے اور خچر ہی سواری کا کام لیا جائے اور روشنی کے لئے مٹی کے تیل کی قندیل ہی استعمال کی جائے اور صرف وہی کپڑا پہنا جائے جو ہاتھ سے بنایا جاتا ہے۔ اس طرح کا قانون علم و تمدن کی توسیع اور اس سے پیدا ہونے والی احتیاجات سے جنگ کرتا ہے اور یہ لازمی بات ہے کہ جبر تاریخ، اس قانون کو بدل کر رکھ دے گا۔

قانون جس قدر جزئی اور مادی ہوگا یعنی مخصوص مواد و رنگ اور مخصوص صورتوں کا حامل ہوگا، اس کے بقاء و دوام کے امکانات کم ہی ہوں گے۔ اس کے برعکس قانون جس قدر کلی اور معنوی ہوگا اور اشیاء کی ظاہری صورتوں پر توجہ دینے کی بجائے اشیاء کے درمیان یا اشخاص کے مابین روابط پر توجہ دے گا اس کے بقاء و دوام کے امکانات زیادہ ہوں گے۔

زمانے کے تقاضے زمانے کے تقاضے، یعنی ماحول معاشرے اور زندگی کے

تقاضے، انسان عقل، ایجاد و اختیار کی قوت سے لیس ہے اور بہتر زندگی کی خواہش رکھتا ہے، اس لیے وہ اپنی اقتصادی، اجتماعی، اور معنوی ضروریات رفع کرنے کے لیے بہتر سے بہتر افکار و نظریات اور عوامل و وسائل کو کارزار حیات میں لانے کی کوشش کرتا

ہے، بہتر اور کامل تر وسائل و عوامل کی زندگی میں آمد خود بخود پرانے اور ناقص تر عوامل کو اپنی جگہ خالی کر دینے پر مجبور کرتی ہے، اس طرح انسان جدید عوامل اور ان کی مخصوص ضروریات سے وابستگی پیدا کر لیتا ہے، انسان کی مادی اور معنوی احتیاجات کے ایک سلسلے سے وابسگتی اور ان احتیاجات کو رفع کرنے والے عوامل و وسائل کا دائمی تغیر اور ان وسائل کا ہمیشہ بہتر ہوتے چلے جانا اور ایک مرحلہ پر خود ان کا نئی نئی احتیاجات کے ایک سلسلے کو وجود میں لانا ہر دور اور زمانے میں ماحول اجتماع اور زندگی کے تقاضوں میں تغیر کا سبب بنتا رہتا ہے اور انسان کو لازمی طور پر جدید تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے، اس طرح کے تقاضوں سے جنگ نہیں کرنی چاہیے اور نہ جنگ کی جاسکتی ہے۔

لیکن افسوس کہ کسی عہد کے دوران پیدا ہونے والے نئے مظاہر بہتر افکار و نظریات اور کامل تر وسائل و عوامل کے اعتبار س زندگی کے لیے زیادہ سعادت بخش نہیں ہوتے۔ یہ انسان ہی ہے جو اپنے زمانے، ماحول اور معاشرہ کو تشکیل دیتا ہے، اور انسان غلطی سے محفوظ نہیں ہے، اس اعتبار سے انسان کی صرف یہی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ وقر کے دھارے پر بہلتا چلا جائے اور اپنے دور کے افکار و نظریات، عادات و اطوار اور پسند و ناپسند کو اپناتا چلا جائے اس کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے وقت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے اور زمانے کی اصلاح کرے اگر انسان خود کو صدفی صد زمانے کے مطابق بناتا رہے گا تو پھر وہ زمانے کو کس چیز سے ہم آہنگ کرے گا؟

افلاس فکر رکھنے والے افراد کے لیے زمانے کے تقاضے یعنی" آج کی پسند اور سلیقہ" اور یہ جملہ" آج کی دنیا پسند نہین کرتے" ہر نظری، عملی، صوری، مادی، قیاسی، تجربی، اور استقرائی منطق کی رو سے ان کی شخصیت کو متاثر کرنے اور ان کے غیر مشروط طور پر سر تسلیم خم کر دینے کے لیے بہت کافی ہے، ان لوگون کے طرز فکر کی رو سے خصوصا دنیا نے مگرب میں کسی چیز کا فیشن اور سلیقہ قرار پانا یہ کہنے کے لیے کافی ہے کہ زمانے کے تقاضے بدل گئے ہین، ان کے نزدیک یہ جبر تاریخ ہے اس سے بچنا ممکن نہیں بلندی و ترقی کے لیے اسے اختیار کرنا لازم ہے، حالانکہ یہ انسان ہی ہے جو اپنے زمانے، ماحول اور اجتماعی عوامل کو تشکیل دیا ہے، یہ چیزین عالم قدس سے نازل نہیں ہوریں، انسان خود وہ مغرب کا رہنے والا ہی کیون نہ ہو غلطی غلطی کا سزاوار ہے۔

انسان عقل اور علم سے آراستہ ہونے کے ساتھ شہوت اور خواہش نفس بھی رکھتا ہے، مصلحت اور زندگی کی طرف وہ اچھے قدم اٹھاتا ہے تو کبھی کبھی اس کے قدم غلط سمت پر بھی اٹھ جاتے ہیں، اس اعتبار سے زمانہ جہان راہ راست پر پیش قدمی کر سکتا ہے وہاں وہ راہ انحراف بھی اختیار کر سکتا ہے، اس لیے جہاں زمانے کی ایسی پیش قدمیوں کا ساتھ دنیا چاہے وہاں اس کے انحرافات کی مزاحمت بھی کرنی چاہیے۔

لفظ" آزادی" کی طرح" زمانے کے تقاضے" ان کلمات میں سے ایک ہے جن کا مشرق کی سرزمین پر بڑا ابراحشر ہوا ہے اور آج یہ کلمہ استعمار کا ایک ایسا مکلم ہتھیار ہے جس سے وہ مشرق کی اصل تہذیب پر ضرب لگائے اور اس پر مغربی روح مسلط کرنے کا کام لیتا ہے کتنے فریب ہیں جو اس عنوان سے دئے جاتے ہیں اور کتنی بد بختیاں ہیں جو اس خوبصورت کتبہ کے ساتھ ہم پر مسلط کی جاتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ زمانہ علم ہے، بلاشبہ یہ بات درست ہے لیکن کیا اس سرچشمہ علم کے علاوہ دوسرے تمام سرچشمے انسان کے لیے خشک ہو چکے ہیں اور آج جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ صحیح و خالص علم کی حیثیت رکھتا ہے؟ آخر کس دور مین ہمارے اس عہد کی مانند علم و دانش کو اس قدر قوت وقدرت اور وسعت حاصل رہی ہے اور کس زمانے میں اس دور کی طرح علم و دانش اپنی آزادی سے محروم ہو کر شہرت کے عفریت کی غلام اور خودغرضی، جاہ طلبی، زر پرستی واستحصال کے اژدھون کا شکار رہے ہیں؟

جو لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ زمانے کے تغیر پذیر تقاضے کسی قانون کو ہمیشہ کے لیے باقی نہیں رہے دیتے انہیں چاہیے متذکرہ بالا دو موضوعات کو ایک دوسرے سے الگ کریں تا کہ انہیں معلوم ہو کہ اسلام میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے، جو بہتر زندگی کی جانب پیش قدمی کی مخالف ہو۔

ہمارے اس دور کی مشکل یہ ہے کہ آج کے انسانکوان دونون باتوں کو الگ کر کے غور کرنے کی بہت کم توفیق ہوتی ہے، وہ قدیم کے ساتھ رشتہ جوڑ کر جمود اختیار کر لیتا ہے اور جو کچھ نیا ہو اس سے لڑنے لگتا ہے یا پھر اس قدر جہلات پر اتر آتا ہے کہ ہرنئی ظاہر ہونے والی چیز کو" زمانے کے تقاضوں" کے نام پر ضروری سمجھنے لگتا ہے۔

حرکت و لچک بعض مسائل جبر تاریخ، ضروریات زندگی میں تغیر زمانے کے تقاضے یہ تینوں باتیں ہمارے لیے سرف یہ جاننے کے لیے مفید ہیں کہ ہم ان بوتوں کو بہانی بنا کر اور آنکھیں بن کر کے کسی قانون کو ہدف نہیں بنا سکتے اور اس کی ابدیت کے مفکر نہیں ہو سکتے۔

واضع ہے کہ صرف ان مسائل پر بحث، قانون کی ابدیت کے مسئلے کی شکل حل کرنے کے لیے کافی نہیں ہے، اس لیے کہ یقیناً اگر کوئُ ابدی قانونزندگی کی تمام متغیر صورتوں کا احاطہ کرنا چاہے اور تمام مشکلات کے حل کرنے کی راہ دکھائے اور ہر مشکل کع بہتر طریقے پر رفع کر دے تو اسے قوت وحرکت کے ساتھ ایک لچک سے بھی بہرہ مند ہونا چاہیے وہ خشک، جامد اور بے لچک نہ ہو، ابن ہم یہ دیکھین گے کہ اسلام اپنی اس اصل کی حفاظت کرتے ہوئے" حلال محمد حلال الی یوم القیامۃ وحرام محمد حرام الی یوم القیامۃ" زندگی کے مختلف مسائل کے حل کی راہ کسی طرح دکھاتا ہے۔

قینیاً اسلام کے قانون سازی کے نظام میں کوئی راز اور رمز چھپا ہوا ہے جو اس بڑی مشکل پر قابو پالیتا ہے اسلام کی منطقی روح کے تمام بھیدون اور رازوں کا سرچشمہ اس انسان کی فطرت وطبعیت، اجتماعیت اور پورے عالم کے ساتھ کامل وابستگی ہے۔

اسلام نے اپنے قوانین وضوابط کے وضع کرنے میں فطرت کے احترام اور فطری قوانین کے ساتھ اپنی وابستگی کا باقاعدہ طور پر اعلان کیا ہے، اسلام کی یہی وہ جہت ہے جس نے قوانین اسلام کے ابدی ہونے کا املان پیدا کر دیا ہے۔

فطرت کے ساتھ اسلام کی وابستگی اور ربط کو مندرجہ ذیل نکات سے سمجھا جا سکتا ہے۔

1۔حریم دین میں عقل کو جگہ دینا

دنیا کے کسی دین نے اسلام کی طرح عقل کے ساتھ اس قدر قریبی رشتہ نہں رکھتا ہے اور اس کے "حق" کو تسلیم نہیں کیا ہے، کسی دین کا نام لیا جا سکتا ہے کہ جس نے عقل کو اپنے احکام کے سرچشموں میں سے ایک سرچشمہ قرار دیا ہو، فقہاء اسلام نے احکام کے چار سرچشمے اور ذریعہ قرار دیئے ہیں، کتاب، سنت، اجماع اور عقل، فقہائے اسلام عقل اور شرع کے درمیان نا قابل شکست رشتے کے قائل ہیں اور اسے ایک لازمی اصول قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں:

"کل ما حکم به العقل حکم به الشرع و کل ما حکم به الشرع حکم به العقل"

"جو کچھ عقل سلیم حکم کرتے ہے شرع بھی اسی کے مطابق حکم کرتے ہے اور جس چیز کا شرع حکم دیتی ہے عقل بھی اس کا حکم کرتے ہے۔"

فقہ اسلامی میں خود عقل کسی قانون کو منکشف کرنے والی ہو سکتے ہے اور وہ کسی قانون میں قیود و حدود وضع کر سکتے ہے یا اس قانون میں عمومیت پیدا کر سکتے ہے اور تمام سرچشموں اور ذرائع سے استنباط کرنے میں بڑی اچھی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

عقل کی دخل اندازی کا حق اس طرح پیدا ہوا ہے کہ اسلامی قوانین زندگی کی حقیقت سے سروکار رکھتے ہیں اسلام اپنی تعلیمات مین ایسی مجہول پر اسراریت اور رمزیت کا قائل نہیں ہے، جسے حل نہ کیا جا سکتا ہو۔

2۔جامعیت اور خود قرآن کی تعبیر کے مطابق وسطیت

کسی قانون کا مکتب کا یکطرفہ ہونا خود اپنے اندر اپنی تنسیخ کی دلیل رکھتا ہے، انسان کی زندگی پر غلبہ رکھنے والے اور اثر انداز ہونے والے عوامل بہت زیادہ ہیں، ان میں سے کسی ایک سے بھی صرف نظر کرنا خود عدم تعادل پیدا کرتا ہے، قوانین کے ابدی ہونے کا سب سے اہم عنصر ان کا تمام مادی، روحانی، انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں پر محیط ہونا ہے، تعلیمات اسلام کی جامعیت اور ہمہ جہتی کی صفت ہی اسلام سے شناسا ہونے والوں کے درمیان اس کی مقبولیت کا سبب ہے، اس نکتہ پر تفصیلی بحث ہماری اس گفتگو کے دائرے سے باہر ہے۔

3۔اسلام نے کبھی زندگی کی ظاہری شکل وصورت سے بحث نہیں کی

تمام اسلامی تعلیمات نے روح اور معانی پر اور اس طریقے پر توجہ دی ہے جو انسان کو ان مقاصد و معانی تک پہنچا تا ہے، اسلام نے مقاصد و معانی اور ان تک پہنچنے کے طریقے کی طرف رہنمائی اپنے ذمے لینے کے بعد انسان کو اس کے علاوہ دوسرے امور میں آزاد چھوڑ دیا ہے، اس طرح اس نے تہذیب وتمدن کے توسیعی عمل کے ساتھ تصادم سے پرہیز کیا ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اسلام میں کوئی مادی وسیلہ اور کوئی ظاہری شکل نہیں ملے گی، جسے تقدس حاصل ہو اور مسلمان کی یہ ذمہ داری ہو کہ وہ اس شکل اور ظاہر کی حفاظت کرے، اس اعتبار سے علم وتمدن کے توسیعی مظاہر کے ساتھ تصادم سے پرہیز اسلام کی ایک ایسی جہت ہے کہ اس نے زمانے کے تقاضوں پر دین کو منطبق کرنے کا کام آسان کر دیا ہے اور اپنی ابدیت کی راہ میں حائل ہونے والی ایک بڑی رکاوٹ کو دور کر دیا ہے۔

4۔اس دین کی خاتمیت اور ابدیت

اس دین کی خاتمیت اور ابدیت کا ایک دوسرا زمریہ ہے کہ قوانین فطرت کے ساتھ ہم آہنگی سے قوت حاصل کرتا ہے اس نے انسان کی مستقل اور دائمی ضروریات کے لیے مستقل اور غیر متبدل قوانین بنائے ہیں اور تغیر پذیر حالات اور صورتوں کے لیے اس نے قابل تغیر وضع قانون کی پیش بینی کی ہے،

سطور بالا میں ہم کہہ چکے ہیں کہ بعض انسان ضروریات خواہ ان کا تعلق انفرادی شعبوں سے ہو یا اجتماعی شعبوں سے اپنی مستقل صورت رکھتے ہیں اور وہ تمام انسانوں میں یکساں ہوری ہیں، اسنان اپنی جبلتوں اور عادتوں کے لیے جو نظام وضع کرتا ہے وہ اخلاق کہلاتا ہے اور اجتماعی زندگی کے لیے جو نظام تشکیل دیتا ہے اس عدالت، کا نام دیا جاتا ہے اور وہ اپنے خالق سے جو رابطہ قائم کرتا ہے اور اپنے ایمان کی تجدید وتکمیل کرتا ہے اسے عبادت کہتے ہیں، ان تینوں کا تعلق ان مستقل قسم کی ضروریات سے ہے۔

انسان کی بعض دوسرے ضروریات تغیر پذیر ہوتی ہیں، جو قانون کے لحاظ سے ایسے قانون سازی کو لازم کرتے ہیں جس میں تبدیلی ہوسکتی ہے، اسلام نے ایسی تغیر پذیر احتیاجات کے لیے وضع قانون کی لچکدار صورت اختیار کی ہے اس طرح اس نے قابل تغیر حالات کے لیے قانون سازی کو مستقل اور غیر متبدل اصولوں کے ساتھ مربوط کر دیا ہے اور وہ اصول ہر تغیر پذیر نئی صورت حال میں خاص متناسب فرعی قانون کو وجود میں لاتے ہیں۔

ہم صرف دو مچالون پر اکتفا کرتے ہیں۔

اسلام میں ایک اجتماعی اصول یہ ہے:

"و اعدوا لهم ما استطعتم من قوه" 16

عنی آخری امکانی حد تک دشمن کے مقابل قوت فراہم کرو اور طاقتور بن کر رہو، کتاب یعنی قرآن ہمیں اس اصول کی تعلیم دیتا ہے، دوسری طرف سنت سے ہمیں ہدایات کا ایک سلسلہ ملتا ہے کہ فہ میں یہ ہدایات "سبق و رمایۃ" کے عنوان سے معروف ہیں، ہدایت کی گئی ہے مسلمان اور ان کے فرزند گھوڑے سواری اور تیر اندازی میں کامل مہارت حاصل کریں، گھوڑے سواری اور تیر اندازی اس دور کے فنون حرب کے ایک اہم جز تھے اور دشمن کے مقابل قور کی فراہمی اور طاقتور بننے کا بہترین ذریعہ تھے، "سبق درمایہ" کے قانون کی اصل تو قرآنکا یہ حکم ہے: " واعدولہم ما استطعتم من قوہ" یعنی اسلام کے نقطہ نظر سے تیر، تلوار اور نیزہ اور گھوڑا اصلیت نہیں

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

رکھتے، یہ اسلامی مقاصد کا جزنہیں ہیں، جو بات اصلیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہر دور اور زمانے میں دشمن کے مقابل اپنے فوجی اور دفاعی وسائل کو آخری حد امکان تک مضبوط طاقتور بنانا چاہیے۔

درحقیقت تیراندازی اور گھوڑا دوڑانے میں مہارت ایک لباس ہے جو دشمن کے مقابل طاقت کے جسم کو پہنایا گیا ہے، دوسرے الفاظ میں تیراندازی میں مہارت اس زمانے میں طاقتور بننے کی ایک عملی صورت تھی دشمن کے مقابل طاقتور بننے کا لزوم ایک مستقل قانون کی حیثیت رکھتا ہے، جو ایک دائمی اور مستقل ضرورت سے قوت حاصل کرنا ہے لیکن تیراندازی اور اسب دوانی ایک وقتی ضرورت کا مظہر ہیں اور زمانے کے تقاضوں اور تہذیبی عوامل کی توسیع کے ساتھ ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے اور دوسری چیزیں جیسے آج کے جدید اسلحہ کے استعمال میں مہارت کا حصول ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔

دوسری مثال، پیغمبر اکرم (ص) نے فرمایا ہے:

"علم و دانش کا حصول ہر مسلمان پر واجب ہے۔"

حکماء اسلام نے یہ ثابت کیا ہے کہ علم و دانش کا حصول اسلامی نقطہ نظر سے دو صوتوں میں واجب ہے: ایک اس صورت میں جبکہ ایمان کا حصول علم و دانش سے وابستہ ہو، دوسرے اس وقت جب کسی ذمہ داری کا پورا کرنا علم و دانش کے حصول پر منحصر ہو۔

دوسری صورت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ طلب دانش کا واجب ہونا تیاری کے لیے ہے کہ انسان کسی ذمہ داری کے ادا کرنے کی قابلیت پیدا کرے۔

اس لیے علوم کا حصول کا واجب ہونا یا نہ ہونا زمانے کے تقاضوں کے مطابق مختلف ہو جاتا ہے، پچھلے بعض ادوار میں اسلامی فرائض کی ادائیگی حتی اجتماعی فرائض جیسے تجارت، صنعت و سیاست کے لیے دانش کا حصول زیادہ ضروری نہیں تھا، اس کے لیے عام تجربات کافی تھے، ہمارے زمانے کی طرح بعض دوسرے زمانوں میں ان فرائض کی ادائیگی اس قدر دشوار و پیچیدہ رہی ہے کہ اس کے لیے برسوں تعلیم اور خصوصی تربیت لازمی قرار پائی تا کہ اسلامی اجتماعی فرائض (واجبات کفائی) انجام پاسکیں، یہی وجہ ہے کہ سیاسی، اقتصادی اور فنی علوم کی تحصیل جو ایک دور میں واجب نہیں تھی، دوسرے دور میں واجب ہو جاتی ہے، ایسا کیوں؟ اسلامی معاشرہ کے استقلال، عزت اور حیثیت کے تحفظ کے لازمی اصول پر عمل کرنا ایک مستقل اور دائمی اسا کی حیثیت رکھتا ہے اور موجودہ دور کے حالات میں تحصیل و تکمیل دانش کے بغیر اس اصول پر پوری طرح عمل نہیں کیا جا سکتا، اس فرض کی ادائگی مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں یکساں شکل مین نہیں رہی ہے، اس سلسلے میں بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

5۔ اسلامی تعلیمات کی فطرت اور طبیعت کے ساتھ ہم آہنگی

ایک دوسرا پہلو جو فطرت اور طبیعت کے ساتھ اسلام تعلیمات کی ہم آہنگی کی علامت ہے جس کی وجہ سے السامی قوانین کی ابدیت کا امکان پیدا ہوتا ہے وہ حقیقی مصالح اور مفاسد کے ساتھ احکام السامی کا علت و معلول کا رابطہ اور اس رو

سے احکام کی درجہ بندی ہے۔

اسلام نے یہ واضح کیا ہے کہ احکام حقیقی مصالح و مفاسد کے ایک سلسلے کے تابع ہیں اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ یہ مصالح و مفاسد ایک ہی درجے میں نہیں رکھے جاتے۔

اسی وجہ سے فقہ اسلامی میں ایک مخصوص باب باب" تزاحم" یا" اہم و مہم" رکھا گیا ہے تاک فقہا اور اسلامی کارکنوں کے لیے مختلف مصالح و مفاسد کے یکجا ہونے اور ان سے واسطہ پڑنے کی صورت میں آسانی حاصل ہو، اسلام نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ اس طرح کے مواقع پر علمائے امت مصلحتوں کی اہمیت کے درجوں کا خود اسلام کی رہنمائی میں پوری توجہ کے ساتھ یقین کریں اور زیادہ اہم مصالح کو کم اہمیت والے مصالح ترجیح دیں اور تعطل کی حالت سے باہر نکل آئیں، رسول اکرم (ص) سے روایت ہے۔

"اذا اجتمعت حرمتان طرحت الصغریٰ للکبریٰ"

" جہاں دو امور واجب الاحترام جمع ہو جائیں تو بڑے امر کی خاطر چھوٹے امر سے صرف نظر کرنا چاہیے۔"

ابن کثیر" النہایہ" میں اس حدیث کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں"

" اگر کوئی ایسا معامہ ہو جس میں جماعت کا فائدہ اور فرد کا نقسان ہو رہا ہو تو جماعت کا مفاد فرد کے نقصان پر مقدم ہے۔"

جو کچھ ابن کثیر نے کہا ہے وہ زیادہ اہم مصلحت کو کم اہمیت والی مصلحت پر مقدم رکھنے کے ایک موقع سے متعلق ہے، حدیث کا فائدہ اسی ایک موقع تک محدود نہیں ہے، مردہ جسم کے اعضاء کی تشریح (Anatomy) کے علم کو ہمارے دور میں علم کی ترقی کے لیے ضروری سمجھا گیا ہے، اس کا تعلق باب" تزاحم" سے ہے، جیسا کہ ہمیں معلوم ہے اسلام نے مسلمان کے بدن کے احترام اور مراسم تجہیز یں عجلت کو لازم قرار دیا ہے جبکہ ہمارے زمانے مین طب کی تعلیم و تحقیق کے ایک حصے کا انحصار تشریح پر ہے، اس طرح دو مصلحتیں ایک دوسرے کے مقابل آ گئی ہیں، ظاہر ہے کہ طبی تعلیم و تحقیق کی مصلحت میت کی جلد تجہیز اور اس کے بدن کے احترام کی مصلحت پر مقدم ہے اس احتیاط کے ساتھ کہ غیر مسلم کی لاشوں کے کافی نہ ہونے کی صورت میں مسلمان کی لاش پر انحصار کیا جائے اور پہچانی جانے والی لاس کو چھوڑ کر نہ پہچنای جانے والی لا استعمال کی جائے اسی طرح دوسرے باتوں کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے، اس طرح" اہم و مہم" کے قاعدہ کے تحت مسلمان لاش کے اعضاء کی تشریح کی ممانعت ختم ہو جاتی ہے، اس قاعدہ کے تحت بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

6۔ اسلامی قوانین کو لچکدار بنانے والے قواعد کا وجود

ایک دوسری چیز جس نے اسلامی ضوابط کو لچک، حرکت اور تطبیق کی خاصیت عطا کی ہے اور ان کی ہیشگی کو برقرار رکھا ہے، بعض کنٹرول کرنے والے قواعد کے سلسلے کی موجودگی ہے جسے اسلامی قوانین کے متن میں شامل کیا ہے، فقہاء نے ان قواعد کا بڑا انچھا نام ہے اور انہیں" حاکمہ" کہتے ہیں یعنی وہ قواعد جو تمام اسلامی احکام و ضوابط پر بالا دستی رکھتے ہیں اور ان سب پر حکومت کرتے ہیں، یہ قواعد اعلیٰ مناسب رکھنے والے انسپکٹروں کی تمام احکام و ضوابط کی نگرانی کرتے ہیں اور انہیں کنٹرول کرتے ہیں، قاعدہ" حرج" اور

قاعدہ" لاضرر" ان ہی نگران قواعد (حاکمہ) سے تعلق رکھتے ہیں، درحقیقت اسلام نے ان نگران قواعد کو ویٹو کیا حق دیا ہے ان قواعد کی داستان بڑی دلچسپ اور مفصل ہے۔

7۔اسلام کا اسلامی حکومت کو بعض مخصوص اختیارات دینا

کچھ دوسرے اختیارات میں جو اسلام نے حکومت اسلام کو اور دوسرے الفاظ میں اجتماع اسلامی کو دیئے ہیں یہ اختیارات ابتدائی درجہ میں خود پیغمبر (ص) کی حکومت سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے بعد امام کی حکومت سے ان کا تعلق ہے پھر ہر شرعی حکومت کو یہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے:" النبی اولی بالمومنین من انفسھم "

" پیغمبر خود مومنین سے زیادہ ان کے نفوس پر تسلط کا حق رکھتا ہے۔

یہ اختیارات ایک وسیع دائرہ رکھتے ہیں، اسلامی حکومت جدید حالات اور جدید ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام کے اساسی اصول ومبانی پر توجہ کر کے ضوابط کا ایک سلسلہ وضع کر سکتی ہے کہ ماضی میں موضوعا موجود نہیں رہے ہیں!17

حکومت اسلامی کی قوت کے لیے ان اختیارات کو وجود لازمی شر ہے تا کہ وہ آسمانی قوانین کا بہتر طریقہ پر اجرا۱۴ اور انہیں بہتر انداز مین زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکے اور ہر دور کے مخصوص لائحہ عمل کو بہتر طور پر مرتب ومنظم کر سکے یہ اختیارات کچھ حدود اور شرائط رکھتے ہیں کہ یہاں ان کے بارے میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔

حوالہ جات

16.سورۂ انفال، آیت ٦٠.

17.رجوع کیجئے" تنبیہ الامہ" مرحوم آیت اللہ نائنی، صفحات ۹۷، ۱۰۲، اور مقالہ" ولایت وزعامت" علامہ طباطبائی کے قلم سے، کتاب" مرجعیت وروحانیت" چاپ دوم صفحات ۸۲، ۸۴۔

ذمہ داری کی منتقلی

کیا یہ درست ہے کہ انسان کی تمام ضروریات بدلتی رہتی ہے اور ضروریات کے تغیر کے ساتھ ان سے متعلق قوانین وضوابط میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے؟ اس کا جواب یہ کہ نہ تمام انسانی ضروریات حالت تغیر میں ہوتی ہیں اور نہ ضروریات کے تغیر کا لازمی نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ زندگی کے بنیادی اصول اور ضوابط ہی میں تبدیلی آجائے ہماری گذشتہ باتوں سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ انسان کا عقلی و علمی بلوغ اور اس کے توانائی کے نئے دور کا آغاز، جس میں اس پر الٰہی قوانین و معارف کے تمام حقائق روشن ہوئے اور دینی ورثوں کی حفاظت، تحریفات اور بدعتوں کے خلاف جنگ، دین کی اشاعت تبلیغ اور دعوت کا کام انجام پایا ختم نبوت کا اصل بنیادی پس منظر ہے، انسان کے دور اول میں مجبوراً" وحی" نے جو ذمہ داری عمدہ طریقے پر پوری کی تھی اسے رشد و بلوغ عقل کے دور میں علمی و عقلی قوت انجام دیتی ہے اور علماء انبیاء کے وارث قرار پاتے ہیں

علمائے اسلام کی ذمہ داری

باوجودیکہ اسلام رائج مذاہب کی روایات کے برعکس علمائے امر کے لیے کسی ایسے اختیار کا قائل نہیں ہے جو طبقاتی امتیاز پر منتج ہو، دین کی بڑی اہم ترین ذمہ داری ان کے شانوں پر عائد کی ہے اسلام کی طرض کسی دین مین علمائ نے ایسا موثر اور حقیقی نقش مرتسن نہیں کیا ہے اور یہ اس دین کی خاتمیت س حاصل ہونے والے خصوصیت ہے، اولیم منصب جو خاتمیت کے دور میں پیغمبرون کی طرف سے علمائے امرت کی جانب منتقل ہوا ہے وہ دعوت، تبلیغ، ارشاد اور تحریفات و بدعات کے خلاف جن کا منصب ہے، انسانی گروہ تمام زمانون مس دعوت و ارشاد کے محتاج رہے ہیں۔ قرآن نے صراحت کے ساتھ ذمہ داری کو خود امت کے ایک گروہ پر ڈالا ہے۔

"وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ‌ؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴿۱۰۴﴾" 18

"تم میں سے ایک گروہ ہونا چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے"

وہ اسباب ہر وقت موجود رہے ہیں جو تحریفات و بدعت پر منتج ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے، یہ علماء امت ہی کی ذمہ داری ہے کہ تحریفوں اور بدعتوں کے خلاف جنگ کریں، رسول اکرم (ص) نے فرمایا ہے:

"اذا ظهرت البدع فعلی العالم ان یظهر علمه و من لو یفعل فعلیه لعنة الله"

"جب بدعتیں ظاہر ہوں یہ عالم کی ذمہ داری ہے کہ اپنے علم کو ظاہر کرے اور جو ایسا نہیں کرے گا اس پر خدا کی لعنت۔"

جو چیز تحریفات و بدعات کے خلاف جنگ کو ممکن اور اس کے کام کو آسان بناتی ہے وہ اصلی معیار و مقیاس یعنی قرآن کا محفوظ رہنا رسلوا کرم (ص) نے خاص طور پر تاکید کی ہے جو کچھ آپ کی زبان سے نقل ہوا ہے اس کی صحت و سقم کو معلوم کرنے کے لیے قرآن کی کسوٹی سے فائدہ اٹھایا جائے۔

کتابون کے اصل متن کو حوادث کے دستبرد سے محفوظ رکھنا، اصول سے فروع کا استنباط، جزئیات پر کلیات کا انطباق ہر دور کے جدید مسائل کی دریافت ان پر غور و بحث، یک طرفہ رجانات کا سد باب، صورتوں، ظواہر اور عادتوں پر جمود کے خلاف جنگ، فرعی ضوابط اور فتیہ سے اصل اور مستقل احکام کو الگ کرنا، اہم و مہم تشخیص اور اہم کو ترجیح دینا وقتی قوانین کے وضع کرنے میں حکومت کے اختیارات کے حدود کا تعین، زمانے کی ضروریات سے ہم آہنگ لائحہ عمل کیا تیاری ختم نبوت کے اس دور میں علماء کے اہم فرائض ہیں۔

امت اسلامیہ کے علام ء اپنی ذمہ داری اور اہم منصب کے پیش نظر اپنے زمانے کے سب سے زیادہ علام افراد ہونے چاہیں کیونکہ وہ انسانوں کے اخلاقی انحرافات اور روحانی انحطاط کے مقتضیات سے وقت کے حقیقی مقتضیات کو جدا کر کے ان کو ٹھیک ٹھیک تشخیص اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ زمانے کی روح سے زمانے کی ساخت میں کارفرما عوامل اور انع وامعل کی سمت سفر سے اچھی طرح واقف نہ ہو۔

اجتہاد

علماء امت کی اہم ذمہ داریوں اور فرائض میں سے ایک اجتہاد بھی ہے اجتہاد کا مطلب صحیح طریقے سے وہ علامانہ کوششجو کتاب، سنت، اجماع اور عقل کے سرچشموں سے استفادہ کر کے اسلام کے اصلو وضوابط معلوم کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔

اجتہاد کا لفظ پہلی بار احادیث نبوی میں استعمال ہوا پھر مسلمانوں مین رواج ہو گیا، قرآن مین یہ لفظ نہیں آیا، روح معنی کے لحاظ سے جو لفظ اس کا مرادف ہے اور قرآن مین بھی آیا ہے وہ "تفقہ" ہے قرآن نے صراحت کے ساتھ تفقہ، دین کی گہری فہم حاصل کرنے کی تاکید کی ہے۔

اجتہاد یا تفقہ سے خاتمیت کے اس دور میں بہت نازک اور بنیادی ذمہ داری وابستہ ہے اور اسلام کی ابدیت کے لیے اسے ایک اہم شرط کی حیثیت حاصل ہے، اجتہاد کو الام کی قوت محرکہ کہا گیا جو بالکل درست ہے بزرگ مسلمان فلسفی ابن سینا بڑی روشن فکری کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث کی ہے وہ کہتا ہے:

" اسلامی کلیات مستقل، غیر متغیر اور محدود ہیں لیکن حوادث و مسائل غیر محدود اور متغیر ہیں اور ہر دور مخصوص تقاضوں اور مخصوص مسائل کا حامل ہوتا ہے، اسی لیے ہر دور اور عہد میں ایسے افراد کی ضرورت ہے جو ماہر، اسلامی کلیاتے کے عالم، زمانے کو درپیش مسائل سے آگاہ اور جو کلیات اسلامی کی روشنی میں جدید مسائل میں اجتہاد و استنباط کی صلاحیت کے حامل اور اس ذمہ داری کو پورا کر سکیں۔" تمدن اسلامی کے درخشان دور میں جبکہ ایک وسیع اور بدوی مسلم معاشرہ ترقی و توسیع کی جانب تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا اور اس نے

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ایشیا کے علاوہ اور افرقہ کے بعض حصوں پر غلبہ حاصل کرلیا تھا اور گونا گون نسلوں اور قوموں پر جن میں سے ہر ایک اپنا ایک خاص ماضی اور تہذیب رکھتی تھی، اسے حکومت کرنے کا موقع ملا، اس دوران ہزاروں جدید مسائل پیدا ہوئے۔ مسلمان اس ذمہداری سے بڑی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے اور دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ علمائے اسلام نے ثابت کر دیا کہ اسلامی سرچشمہ اپنی بہتر تشخیص اپنے بہتر اسنباط سے ترقی و تکمیل کے مراحل سے گزرنے والے کسی بھی معاشرہ کے ساتھ چل سکتے ہیں اور اس کی رہنمائی کر سکتے ہیں ۔انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ" اسلامی حقوق" کا قانون یعنی (etytlpocedure) زندہ ہے اور زمانے کی ترقی سے پیدا ہونے والے تقاضوں کے ساتھ ہمآہنگی کی قابلیت رکھتا ہے اور ہر دور کی ضروریات کا جواب دے سکتا ہے۔

مستشرقین اور ماہرین قانون جنہوں نے اس دور کی فقہ اسلامی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اس حقیقت کے معترف ہیں اور حقوق اسلامی یعنی اسلام کے (etvilprocedure) کو مستقل" مکتب قانون" کی حثیت سے تسلیم کیا ہے اوورا سے ایک زندہ مکتب قانون قرار دیا ہے۔

ساتویں صدی ہجری تک اجتہاد کا حق محفوظ تھا اور اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا البتہ اس ساتویں صدی میں خاص تاریخی اسباب کی بنا پر شوری اور اجماع کو بنیاد بمنا کر علماء سے یہہ حق سلب کرلیا گیا اور علماء ہمیشہ کے لئے دوسری اور تیسری صدی ہجری کے علماء کے نظریات کا اتباع کرنے پر مجبور ہو گئے اور یہیں سے چھ معروف مذاہب تک فقہی مذاہب کی تجدید وجود میں آئی۔

اجتہاد کے دروازے کا بند ہوجانا عالم اسلام کا ایک بڑا المناک حادثہ سمجھا جاتا ہے شاید اجتہادات میں افراط کے سلسلہ کے خلاف ردعمل کے طور پر ایسا ہوا ہو بہر کیف فقہ اسلامی میں جمود اور ٹھراؤ اسی وقت سے شروع ہوا۔

اجتہاد کے دروازے کے بند ہونے کے ناپسندیدہ اثرات اہل تشیع پر بھی مرتب ہوئے ساتویں صدی ہجری کے بعد شیعہ فقہ میں عمیق فکر ونظر پیدا ہوگئی تھی اور بعض شعبوں میں وسیع تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس فقہی سسٹم میں بھی چند صدی پہلے کی طرح مسائل کی تشریح کا رجحان اور وقت کے مسائل کا سامنا کرنے سے گریز اوعرجدید و عمیق تر طریقوں کے دریافت کی جانب سے بے رغبتی واضح صورت میں نظر آتی ہے۔نہایت افسوس کی بات یہ ہے کہ حالیہ صدیوں ل کے دوران نجوانوں اور اصطلا حا روشن فکر مسلمانوں کے طبقے میں مغرب کی طرف میلان، مشرقی و اسلامی روایات کی نفی کی رجحان اور مغربی" آزمون" کی اندھی تقلید کا مرض پیدا ہو گیا ہے۔ بدقسمتی سے یہ مرض بڑھتا جا رہا ہے لیکن خوش نصیبی کا پہلو یہہ ہے کہ ان اندھے اور خوابیدہ رجحانات کی تاریکی میں بیداری اور آگاہی کا ایک کرن بھی پھوٹ رہی ہے۔

اس خواب غفلت میں مبتلا کرنے والی گمراہی کی جڑ وہ غلط تصور ہے جو یہ گروہ اصطلا حا اسلامی ضوابط کے تحکمانہ، ادعائی (dogmatie) پہلو کے بارے میں رکھتا ہے۔ گذشتہ صدیوں کے دوران اجتہاد میں جمود نے ان غلط تصورات کو تقویت فراہم کی ہے۔قوم کے رہنمائی اور ذمہ دار افراد کا غرض یہ ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے علمی و منطقی انداز میں اس طرح کے رجحانات کا مقابلہ کرنے کے لئے اتھ کھڑے ہوں۔

اس صورت حال کے اسباب وعوامل کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں جس بات پر ہمیں پردہ نہیں ڈالنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ فکری جمود اور ٹھہراؤ گذشتہ صدیوں کے دوران عالم اسلام پر مسلط رہا ہے۔خسوصا اسلامی فقہ ۹ میں جمود۔ ماضی کی طرف دیکھنے اور زمانے کی روح کو سمجھنے اور اس کا سامنا کرنے سے گریز ہماری اس ناکامی اور شکست کا ایک بڑا سبب سمجھا جاتا ہے آج عالم اسلام کو ہمیشہ سے زیادہ ایک ایسی قانون سازی کی تحریک کی ضرورت ہے جو ایک جدید وسیع اور ہمہ گیر نظر سے اسلامی تعلیمات کی گہرائی سے فیض حاصل کرے اور مسلمانوں کے دست و پا کو مغربی افکار و نظریات کے استعماری بندھنوں سے آزاد کرائے۔

قرآن بے پایان استعداد وسعت کے اعتبار سے فطرت کی مانند ہے

فلسفہ کے موضوعات میں سے ایک حیرت انگیز موضوع کا تعلق اسلامی سرچشموں خصوصا، قرآن کریم کے مضامیں میں تحقیق، دریافت واستنباط ہے صرف فقہ اور حقوق کے مسائل ہی نہیں تمام شعبوں کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے ہر انسانی کتاب خواہ وہ ایک بڑا شاہکار ہی کیاں نہ ہو تحقیق ومطالعہ کے لئے اپنے اندر محدود استعداد اور ختم ہوجانے والی وسعت رکھتی ہے اور اس کتاب کے تمام نکات کو واضح کرنے کے لئے چند ماہرین کافی ہوسکتے ہیں لیکن قرآن نے جن پر گذشتہ چودہ صدیوں کے دوران ہمیشہ سینکڑوں ماہرین تحقیقی کا کرتے رہے ہیں یہ ثابت کردیا ہے کہ تحقیق واجتہاد کے نقطہ نظر سے وہ بے پایان استعداد اور وسعت اپنے اندر رکھتا ہے۔قرآن اس اعتبار سے فطرت کے مانند ہے کہ جس قدر فکر ونظر وسیع تر اور عمیق تر ہوتی چلی جاتی ہے قرآن کے مضامین میں تحقیقات و مطالعہ کی پہنائی اور زیادہ وسیع ہوتی چلی جاتی ہے اور نئے سے نئے سے نئے راز سامنے آتے چلے جاتے ہیں مبدا و معاد حقوق، فقہ، اخلاق، تاریخی قصص اور طبیعیات سے متعلق جن مسائل کا ذکر قرآن میں آیا ہے اگر ان کا دقیق مطالعہ کرنے کے بعد چودہ صدیوں کے دوران ابھرنے والے اور پرانے ہوجانے والے نظریات کے ساتھ موازینہ کیا جائے تو حقیقت پوری طرح روشن ہوجائے گی۔

فکر ونظر خواہ کتنی ہی ترقی کرجائے اور وسیع تر وعمیق تر ہوجائے وہ خود کو قرآن کے ساتھ ہم آہنگ پائے گی حقیقت یہ ہے کہ آسمانی کتاب کو جو ایک باقی رہنے والا معجزہ ہے ایسا ہونا چاہیئے۔

قرآن کے نزدیک سن سے بڑا دشمن جمود اور ایک خاص زمانے اور متعین مرحلے کی دانش پر انحصار کرنا ہے جیسا کہ علوم فطرت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوت تھی کہ ہمارے علماء یہ سمجھتے تھے کہ فطرت کا علم وہی ہے جو ماضی میں ارسطو اور افلاطون وغیرہ جیسے افراد نے ترتیب دیا ہے۔

قرآن کے مفاہیم ہر زمانے کے لوگوں کے لئے تر وتازہ ہیں

قرآن کریم حتی کہ خود رسول اکرم (ص) کے جامع کلمات اپنے اندر تحقیق وکاوش کے بے وسعت رکھتے ہیں، اس لئے نظروں کو محدود ہوکر نہیں رہ جانا چاہئے۔اول روز سے اسلام کے عظیم رہبر کی وجہ اس جانب رہی ہے اور آپ (ص) اسے اپنے اصحاب

کے گوش زد کرتے رہے ہیں رسول اکرم (ص) نے بار بار اپنے کلمات میں اس نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قرآن کو ایک خاص زمانے کی دانش وبینش کے ساتھ محدود نہ کرو۔ آپ نے فرمایا: "قرآن کا ظاہر خوبصورت اور اس کا باطن عمیق ہے جس کی ایک حد وں ہایت ہے پھر اس کے اوپر ایک اور حد و نہایت ہے اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے اور اس کی تازگیوں پر کبھی پژمردگی طاری نہیں ہوگی۔"

امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا: "یہ کیا راز ہے کہ قرآن کو لوگوں کے درمیان جس قدر پھلا یا جاتا ہے اور اسے پڑھا جاتا ہے اور اس کے بارے میں بحث وفکر کی جاتی ہے اسی قدر اس کی طراوت وتازگی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے؟" امام (ع) نے جواب دیا: "ایسا اس لئے ہے کہ قرآن کو ایک خاص وزمان کے لئے اور کسی خاص قوم کے لئے نازل نہیں کیا گیا ہے قرآن تمام زمانوں کے لئے اور تمام انسانوں کے لئے ہے اس اعتبار سے وہ ہر زمانے میں جدید ہے اور تمام لوگوں کے لئے ہر وقت تاززہ ہے۔"

رسول اکرم (ص) جب اپنی احادیث کو ٹھیک ٹھیک یاد کرنے اور دوسروں تک پہچانے کی تاکید فرماتے تھے تو اس میں یہ خاص نکتہ پوشیدہ ے ھا کہ شاید جس شخص نے آپ سے براہ راست آپ کی احادیث کو سنا ہو تفقہ سے بہرہ مند نہ ہو اور وہ کسی صاحب دانش وبینش تک انہیں منتقل کرنے کے لئے محض ایک رابطے کا کام دے یا پھر جو شخص آپ سے حادیث سنے وہ تفقہ سے بہرہ منر ہو لیکن اس کے ذریعہ جس شخص تک کی کوئی حدیث پہچانے والے سے زیادہ تفقہ کا مالک۔

تاریخ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بعد کے زمانوں میں آن حضور (ص) کی احادیث مفاہیم ومطالب کے سمجھنے میں پہلے سے زیادہ تفقہ سے کام لینے کی ضرورت پیش آئی۔

اجتہاد کی اضافیت

ترقی وتکمیل کی طرف مسلسل بڑھنے والی دانش وبینش کا اثر کسی جگہ اس قدر محسوس نہیں کیا جا سکتا جس قدر کہ فقہی مسائل میں اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ فقہ اسلامی پر کئی دور گزر چکے ہیں ہر دور میں ایک خاص طرز فکر اور ایک خاص دانش حکمفرما رہی ہے۔ آج کے استنباط کے قواعد سے مختلف ہیں۔ ایک ہزار سال پہلے کے علماء جیسے شیخ طوسی یقینا ایک ممتاز مجتہد رہے ہیں اور لوگوں نے ان کی جو پیروی وتقلید کی ہے وہ صحیح ہے قدیم علماء کا طرز فکر ان کی ایسی کتابوں سے واضح ہے جو فقہ خصوصا اصول فقہ پر لکھی گئی ہیں۔

شیخ طوسی کی اصول فقہ پر بعض کتابیں ان کے طرز تفکر کو بخوبی ظاہر کرتی ہیں یہ کتابیں آج بھی موجود ہیں۔

حالیہ ادوار کے فقہاء پر نظر ڈالیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سابق طرز تفکر منسوخ ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ جدید تر عمیق تر اور وسیع تر دانش نے پرانے طرز فکر کی جگہ حاصل کرلی ہے۔ جیسا کہ موجودہ دور میں سماج، نفسیات اور قانون کے شعبوں میں علم ودانش نے فقہی مسائل میں زیادہ گہرائی کے امکانات پیدا کردئے ہیں۔

اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ کیا اس سابق عہد کے علماء اپنے اس وقت کے تفقہ اور طرز فکر کے ساتھ مجتہد کے مقام پر فائز رہے ہیں؟ اور کیا وہ اس بات کے مستحق تھے کہ عوام ان کی تقلید کرتے اور ان کے تفقہ کو اسلامی ضوابط کی تشخیص وتدوین کا اہل قرار دیتے؟ ان

سوالات کا جواب اثبات میں دیا جائے گا۔

پھر اگر یہ سوال کیا گیا کہ موجودہ دور میں اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ چاتھی اور پانچویں سدی کے بعد کی تمام کتابیں اور تالیفات اور آچار کو جوں کا توں قبول کر لے اور خود کو پانچویں صدی میں فرض کرے اور شیخ طوسی جیسے علماء نے جن کتابوں کا مطالعہ کیا تھا ان ہی کا وہ بھی مطالعہ کرے اور وہی طرز تفکر اور وہی تفقہ اپنے اندر پیدا کرے جو ان علماء نے اپنے اندر پیدا کیا تھا تو کیا وہ مجتہد کہلا سکے گا اور لوگوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اس کی تقلید کریں؟ اس کا جواب نفی میں دیا جائے گا۔ آخر ایسا کیوں؟ اس شخص کے درمیان اور پانچویں صدی کے لوگوں کے درمیان کیا فرق ہے؟

فرق یہ ہے کہ ان علماء نے جس دور میں زندگی بسر کی تھی اس کی دانش و بینش اسی دور کے لئے تھی یہ شخص ایسے عہد میں زندگی بسر کر رہا ہے جس میں ماضی کے اس طرز تفکر اور تفقہ کی جگہ ایک جدید تر طرز تفکر اور تفقہ نے لے لی ہے اور ماضی کا وہ طرز تفکرات منسوخ ہو چکا ہے۔

اس سے یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ اجتہاد ایک اضافی اور تکاملی مفہوم رکھتا ہے ہر دور ایک مخصوص دانش و بینش پیدا کرتا ہے۔ یہ اضافیت دو چیزوں سے ختم ہو جاتی ہے۔ اشف و تحقیق کے لئے اسلامی سرچشموں کی بے پایان وسعت و صلاحیت اور دوسرے انسانی افکار اور علوم طبیعی کی تکمیل خاتمیت کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔

حوالہ جات

18. سورہ آل عمران، آیت ۱۰۴۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور